ISSN 0974-7346

مئی ۲۰۲۶ء

جلد۲۱۳ــــعدد ۵

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank
اکاؤنٹ نمبر: 4761005500000051
آئی ایف ایس سی: PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:
info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۳ | ماہ ذوالقعدہ ۱۴۴۷ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۲۶ء | عدد ۵

مجلس ادارت

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی
پروفیسر شریف حسین قاسمی
پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مرتبہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سیکریٹری:
ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر:۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات — محمد عمیر الصدیق ندوی — ۴

مقالات

تراجم قرآن اور مستشرقین — ڈاکٹر مجتبیٰ فاروق — ۷

احادیث نبویہ کا کمپیوٹرائزیشن: محمد مصطفیٰ الاعظمی کی خدمات — ڈاکٹر شکیل الرحمن — ۲۷

مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمہ نگاری — ڈاکٹر محمد اکرم السلام اعظمی — ۴۲

مدارس عربیہ میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے — ڈاکٹر ظفر الاسلام خان — ۵۱

فیضی کی ترجمہ کردہ بھگوت گیتا کا ایک مختصر جائزہ — ڈاکٹر سرفراز احمد خان — ۵۷

احمد امین کی کتب ثلاثہ میں اسلامی فکری تاریخ — ڈاکٹر محمد یوسف میر — ۶۳

اخبار علمیہ

ہندوستانی ثقافت کے عربی مصادر پر سیمینار — کلیم صفات اصلاحی — ۷۰

اخبار عالم

افریقیوں کو غلام بنانا تاریخ کا سب سے بڑا جرم: اقوام متحدہ — ظفر الاسلام خان — ۷۲

تبصرۂ کتب — ع۔ص، ک۔ص اصلاحی، ف۔اصلاحی — ۷۴

ادبیات

جائیں گے دوبارہ طیبہ ہم — ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی — ۸۱

رسید کتب موصولہ — ۸۲

شذرات

علامہ شبلی نعمانی کی قومی وملی خدمات میں وقت کی ضرورت کے لحاظ سے ایک نہایت اہم خدمت بلکہ کارنامہ، تاریخ کے تعلق سے غلط واقعات اوران کی غلط ترجمانی وتشریح کو حقیقت وواقعیت کی روشنی میں لاکر تاریخی غلطیوں کی تصحیح کرنا تھا۔اس کے لیے مارچ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے دہلی کے ایک اجلاس میں صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی کے قیام کی تجویز پیش کی۔اس صیغہ کے سکریٹری مولاناسید سلیمان ندوی مقرر کئے گئے۔اس زمانہ میں نصاب میں شامل کئی تاریخی کتابوں کے غلط اور قابل اعتراض حصوں کی نشاندہی کی گئی۔اسی طرح الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ وجغرافیہ کی کئی کتابوں کے بعض مضامین کی تصحیح کی گئی۔صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی کی عمر تو کم رہی لیکن علامہ شبلی کی فکر اور اس کام کی اہمیت نے دارالمصنّفین کی شکل میں اس ادارہ کو وجود بخشا جس نے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے تعلق سے ہر تدلیس وتلبیس وتحریف کو حقیقت کی روشنی میں لانے کا فریضہ انجام دیا۔قرآن کریم، سیرت النبیؐ اور تاریخ ملت پر غلط بیانیوں کا ردوابطال اور تحقیق وتصحیح کا یہ عمل، مستشرقین سے مورخین ہند تک جس طرح جاری رہا وہ دارالمصنّفین کی بھی تاریخ کا نمایاں ترین باب ہے۔

***

مستشرقین کے اعتراضات اور جادوناتھ سرکار اور ان جیسے مورخین کی غلط بیانیوں کے علمی وتحقیقی جوابوں کی موجودگی کے بعد گویا تاریخی اغلاط پر نظر ثانی کا عمل رک سا گیا تھا لیکن اب ایک بار پھر اسلام دشمنی کے عالمی اور خاص طور پر ملکی حالات نے نفرت وعداوت کو ہوا دینے کے لیے تاریخ خصوصاً ہندوستان کی مسلم تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششوں کو تیز تر کر دیا ہے۔مسلمانوں کے دور حکومت، ملک سے ان کی محبت، عدل وانصاف پر مبنی ان کے اداروں کی بے مثال روایات اور ملک کی معاشی واقتصادی خوش حالی، عوام کے معیار زندگی کو بلند تر کرنے کے ان کے ترقیاتی منصوبے، فوج اور انتظامیہ اور شہری نظم ونسق میں مسلم حکمرانوں کی کوششوں اور سب سے بڑھ کر صدیوں تک ایک کثیر تہذیبی ومذہبی ولسانی ملک کو محبت اور باہمی تعاون پر مشتمل عوامی رویوں کو رواج دینے کی کاوشوں کو جس طرح مسخ کیے جانے اور ہر تاریخی سچائی کو دروغ گوئی اور افترا پردازیوں کے ذریعہ برباد کرنے کا عمل ایک مخصوص نظریاتی ادارہ اوراس کے زیر اثر حکومت وانتظامیہ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔وہ انگریزوں کی تاریخی غلط بیانیوں بلکہ جرائم سے کہیں زیادہ

مہلک اور فتنہ انگیز ہوتا نظر آتا ہے۔ جب سید سالار مسعود غازی کو ایک آئینی حکومت کا سربراہ مافیا کے لفظ سے تعبیر کرنے لگے۔ جب مسجدوں، خانقاہوں اور محلوں اور عمارتوں کو تاریخ کے نام پر جھوٹ اور کذب بیانی کی انتہا پسندی کا شکار بنانے میں کوئی جھجھک نہ ہو تو وقت کی ضرورت خود تقاضا کرتی ہے کہ جس طرح ماضی میں دروغ گوئی پر مبنی تاریخ سازی کا اصل چہرہ سامنے لایا گیا، اسی طرح اب قوم و ملک کے سامنے پھر اسی ضرورت کی اہمیت کو سامنے لایا جائے۔ جدید ذرائع ابلاغ کے وقتی اثرات اپنی جگہ لیکن ٹھوس سنجیدہ تحقیقی مطالعہ کی لامحدود افادیت سے اس کا کوئی موازنہ نہیں۔ تاریخ کی حقیقت میں دہرانے کا عمل ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ وقتی گرد و غبار سے تاریخ کی اصل تصویر کبھی نظر سے اوجھل نہ ہو۔

***

کچھ دنوں پہلے یعنی ۵/ اپریل کو ندوۃ العلما کی مجلس تحقیقات و نشریات اسلام میں پروفیسر محسن عثمانی کی یہ تجویز قدر کی نظر سے دیکھی گئی کہ موجودہ حالات میں ہندتوا کے نام پر تاریخی وتہذیبی سیلاب کو روکنے کے لیے ایسے محققین کی جماعت تیار کی جائے جو تاریخ کی سچائیوں کو حکمت و تدبر کی روشنی میں پیش کر سکے۔ اس کے بعد دہلی میں انڈیا ہسٹری فورم کے اہتمام میں ۱۱۔۱۲/ اپریل کو انڈیا اسلامک کلچر سنٹر کی خوبصورت عمارت میں نیشنل ہسٹری کانفرنس کے انعقاد نے گویا صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی کے پس پشت علامہ شبلی کے ذہن و فکر کی عملی تجدید کا اعلان کر دیا۔ عرصہ بعد بلکہ شاید ایک صدی بعد دہلی کی سرزمین نے ایک قومی و ملکی ضرورت کے لیے خود کے دارالخلافہ ہونے کی صدا بلند کی۔ اس کانفرنس میں مورخین کی تعداد سے کہیں زیادہ وہ لوگ شامل تھے جو ملک کو مطلوب ایک نہایت ضروری فرض کے احساس و شعور سے لبریز تھے۔ کانفرنس کی ابتدائی گفتگو میں ملک کی متعدد یونیورسٹیوں اور تعلیمی قومی اداروں کے حوالے سے بتایا گیا کہ وہاں تاریخ خصوصاً تاریخ ہند کی تدریس کے تعلق کی صورت حال کیا ہے۔ ان اداروں میں جن کی خدمات بیان کرنے کے لائق سمجھی گئیں، ان کا بھی ذکر کیا گیا۔ مگر ایک سننے والے کو حسرت ہی رہی کہ اس موقع پر علامہ شبلی اور دارالمصنّفین کی خدمات، ان کی اولیات بلکہ اس باب میں ان کے بیش قیمت علمی تحقیقات کے ذکر سے سماعتیں اور دل و دماغ شاد کام ہوں۔

***

کانفرنس کی افتتاحی نشست میں ششی تھرور، منوج کمار جھا، اشوک کمار پانڈے جیسے دانشور تھے جو تاریخ سے زیادہ سیاست کی دانش حاضر کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔ اس وقت ملی مسائل کی ایک

آواز جناب محمد ادیب بھی موجود تھے لیکن اس افتتاحی تقریب کی اصل روح سید سعادت اللہ حسینی امیر جماعت اسلامی ہند کی تقریر تھی، جنہوں نے تاریخ اور اس کے مالہ وماعلیہ پر حد درجہ فاضلانہ اور عارفانہ معلومات سے کانفرنس کی غرض وغایت کا تعین کر دیا۔ بہت دنوں کے بعد ہزاروں کے مجمع میں یہ آواز صراحت کے ساتھ بلند ہوئی کہ ہندوستان کو مسلمانوں نے جن نعمتوں سے شاد و آباد کیا ان میں سب سے بڑھ کر عقیدہ توحید کی نعمت ہے۔ تاریخ کی سچائی میں جس طرح دنیا کے بتکدوں کا ذکر آنا چاہیے۔ اسی طرح خدا کے گھروں کی تعمیر کرنے والوں اور ان کو آباد کرنے والوں کی سچائی کا اظہار بھی ہے۔

کانفرنس کی ایک اور اہم نشست میں پروفیسر نجف حیدر، پروفیسر پرویز نذیر، ڈاکٹر ارشد اسلام، اور جناب سہیل ہاشمی کے مقالات تھے۔ خواتین کی تاریخ نویسی کا مظہر ایک جدا نشست میں سامنے آیا، چاند بی بی اور رضیہ سلطان کا عہد یاد کیا گیا۔ کاش نواب سلطان جہاں بیگم کی کوکب سلطانی اور تزک سلطانی کا مطالعہ پیش کیا جاتا جس کی روشنی میں مسلم حکمرانوں کی مذہبی ہی نہیں، معاشی، سماجی اور تہذیبی روایات کی وہ تصویر سامنے آجاتی جو ان بیگمات کے ہم عصر اور ہم سر حد ریاستوں جیسے گوالیار اور اندور وغیرہ میں نظر نہیں آتی۔ بعد کی نشستوں میں مندروں کی مسماری کے فسانوں پر ڈاکٹر رام پنیانی، ہندوستان مسلمانوں کی نسلی بنیادوں کے مطالعہ پر اے ایس پوتھیگے، قرون وسطی کے مسلم اداروں اور ان کی وراثت پر ڈاکٹر عزیز الدین حسینی جیسے نامور مورخین کے مقالات نے سیمینار کی وقعت میں اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ مسلم حکمرانوں اور بلدیاتی ترقی، بازار، سرائے اور شاہراہوں کی تعمیر میں مغل حکومت کا کردار جیسے عنوانوں پر ڈاکٹر رحما، جے، رشید اور پروفیسر رفیع اللہ اعظمی کے مقالات بھی پروگرام میں شامل رہے۔ مقالات کی خاص نشستوں کے علاوہ بعض ذیلی پروگراموں میں اہم تاریخی کتابوں کے تعارف و تبصرہ اور ان پر مکالموں کی نشستیں بھی پروگرام کی افادیت کا سبب بنیں۔ برنی کے ذکر میں ڈاکٹر عزیز الدین حسینی کی یہ بات اکثر سامعین کے لیے نئی ہی تھی کہ اسلام میں مسلمان مرد وعورت کے لیے تعلیم کا حصول فرض ہے۔ اس فرض کو اگر پورا نہیں کیا گیا تو اس کا سبب خلافت کا موروثیت اور ملوکیت میں بدل جانا تھا۔ ایک نشست اس لحاظ سے بڑی مفید تھی کہ اس میں مشہور انگریزی صحافی ضیاء السلام کی کتاب 'بینگ مسلم ان ہندو انڈیا' پر خود مصنف سے سوال جواب ہوئے۔ یہ ہسٹری کانفرنس سامعین کی کثرت کی وجہ سے کامیاب ہی کہی جائے گی۔ موجودہ حالات میں ایک خاص ذہنیت کی انتہا پسند احیانیت کی منظم یلغار روکنے کی فکر اگر اس کانفرنس سے زندہ ہو تو اصل کامیابی کا احساس شاید زیادہ ہو۔

***

مقالات

تراجمِ قرآن اور مستشرقین

ڈاکٹر مجتبیٰ فاروق
پوسٹ ڈوکٹورل فیلو، سنٹر فار اسٹیڈی اینڈ ریسرچ، نئی دہلی
mujtabafar@gmail.com

قرآن مجید کے تراجم صرف رشد وہدایت یا دعوت و تبلیغ کے مقصد سے ہی نہیں بلکہ اس پر تنقید، مناظرہ، مباحثہ اور اس پر اعتراضات اٹھانے کی غرض سے بھی کیے گئے۔ عیسائی دنیا کو اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ اس نے تمام یورپی اور مغربی زبانوں میں اس کلامِ الٰہی کا ترجمہ کیا اور یورپ و مغرب کی ہر لائبریری اور ادارے میں تراجم قرآن دستیاب ہیں۔ یورپی اور مغربی مترجمین زیادہ تر اپنے مطلب کی باتوں کو تلاش کرتے ہیں اور قرآن مجید کو "اغلاط" سے پُر کلام قرار دینا ان کا مقصدِ اصلی رہا۔ انھوں نے باضابطہ انفرادی و اجتماعی طور پر اس کام کو انجام دیا بلکہ اس کے لیے اکیڈمیز اور یونیورسٹیوں میں شعبے بھی قائم کیے۔ بارہویں صدی سے عیسائی دنیا نے لاتینی زبان سے قرآن مجید کے تراجم کا آغاز کیا۔ اس کے بعد تراجم نگاری اور علومِ قرآن کے سلسلے میں مستشرقین نے وسیع پیمانے پر کام کیا۔ اس سلسلے میں سولہویں صدی میں یورپ کے تعلیمی اداروں میں عربی زبان و ادب کے لیے مشرقی علوم خصوصاً عربی زبان و ادب کے شعبوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سترہویں صدی عیسوی میں قرآن مجید کے انگریزی تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر ان انگریزی تراجم پر انحصار کرکے دوسرے مترجمین نے بحث کی راہ اختیار کی۔

تراجم قرآن کے مراحل: تراجم قرآن کو آغاز سے لے کر آج تک چار مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا مرحلہ: مستشرقین کی طرف سے اولین ترجمہ قرآن لاتینی زبان میں ۱۱۴۷ء میں رابرٹ رٹن سن کے ترجمۂ قرآن سے شروع ہوا۔ یہ مرحلہ پانچ صدیوں تک یعنی ۱۶۷۴ء تک جاری رہا۔ اس طویل عرصے کے دوران یہ لاتینی ترجمہ تمام اہلِ یورپ کے لئے قرآن کے تعارف کا ذریعہ تھا۔ پھر اس کا دیگر یورپی زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا لیکن یہ لاتینی ترجمہ دراصل قرآن کا بامعنیٰ

ترجمہ نہیں تھا بلکہ اس کی تفسیر و تعبیر تھی۔ دوسرے مرحلے کا آغاز آندرے دو ریار (Andre Du Ryer) کے فرانسیسی ترجمے کی اشاعت کے ساتھ ۱۶۴۷ء میں ہوا جس کا یورپ پر ۱۶۵۸ء تک تسلط رہا۔ اس ترجمے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دیگر یورپی زبانوں خصوصا انگریزی، جرمن، ڈچ اور روسی زبانوں میں قرآن کے تراجم کی بنیاد یہی ترجمہ تھا۔ انگریزی زبان کا اولین ترجمۂ قرآن جو الیگزینڈر روس نے کیا وہ بھی درحقیقت دوریار کے فرانسیسی ترجمے کا ہی چربہ تھا۔ تیسرا مرحلہ لاتینی زبان میں ۱۶۹۸ء کو لوڈو ویکو مراکی (Lodovico Marracci) کے ترجمۂ قرآن سے شروع ہوا۔ یہ ترجمہ پہلے کے تمام تراجم کے مقابلے میں زیادہ وسعت کا حامل تھا کیونکہ اس کے تعلیقات اور حواشی میں تفسیر و تاویل بھی شامل کیا گیا تھا۔ ۱۷۳۴ء میں شائع ہونے والے سیل (Sale) کا مشہور زمانہ انگریزی ترجمۂ قرآن اسی لاتینی ترجمے سے ماخوذ تھا۔ ان دونوں لاتینی اور انگریزی تراجم نے انیسویں صدی عیسوی کے نصف تک کے منظرنامے پر غلبہ جمائے رکھا۔ چوتھا مرحلہ تاحال جاری ہے، اس کی ابتدا انیسویں صدی عیسوی کے نصف میں ہوئی۔ اس مرحلے میں مختلف یورپی زبانوں میں تراجم کیے گئے۔ اس پہلو سے جے، اے راوڈویل اور ریچرڈ بیل کے تراجم اہم ہیں۔ دونوں تراجم انگریزی زبان میں ہیں۔ دونوں نے ولیم میور اور تھیوڈور نولڈیکے کی تحقیقات کو تطبیق دینے کی کوشش کی ہے[1]۔ ذیل کے سطور میں مستشرقین کے چند مشہور تراجم قرآن کی تاریخ، تعارف اور ان کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

پادری نبقی طاس (Nicitas) **کا ترجمہ:** استہزائی اور جدل پر مبنی قدیم سُریانی زبان اور نصرانیوں کی یونانی کتابوں میں کئی مقامات پر قرآنی "اقتباسات" ملتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ یونانی زبان میں سب سے پہلے بیزنطین کے ایک پادری نبقی طاس نے مشنری مقصد کے تحت قرآن کے ایک حصے کا مکمل اور باقی کا ملخص پیش کیا تھا اور اس میں کذب بیانی اور بغض و عناد سے کام لیا تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ اس ترجمے کے متعلق لکھتے ہیں کہ فرانسیسی مستشرقہ مس دلویرنی (Dialverny) نے ان سے بیان کیا کہ نبقی طاس نے نویں صدی عیسوی (تیسری ہجری) میں اسلام کے خلاف کئی جدلی رسالے لکھے ہیں جو 'پاترولوجیا گریکا' Patrologia Graeca نامی کتاب میں چھپ چکے ہیں اور

---

[1] محمد مہر علی، مستشرقین کے تراجم قرآن، ایک جائزہ، ماہنامہ تعمیر افکار، کراچی، جلد:۱۱، شمارہ:۸، ۹، ۱۰، اگست، ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۰ء۔

ان میں قرآنی اقتباسات یونانی زبان میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ "میری معلومات کے مطابق قدیم ترین فرانسیسی ترجمۂ قرآن میشیل بوڈیئے (Michael Baudier) کا ہے جس کا زمانہ ۱۵۸۰ء تا ۱۶۴۵ء کا ہے۔ یہ مستقل ترجمۂ قرآن نہیں ہے، بلکہ اس کی کتاب "ترکوں کے مذہب کی تاریخ" (Histoire De La Reigion Des Turcs) مطبوعہ ۱۶۲۵ء میں بکثرت آیاتِ قرآن کا کامل مفہوم یا خلاصہ دیا گیا ہے۔ اچھا ہو یا برا، یہ سب سے پرانا ترجمۂ قرآن ہے جو فرانسیسیوں کو ان کی اپنی زبان میں پڑھنے کو ملا تھا۔[۲]

رابرٹ آف کیٹن (Robert of Ketton:1110-1160): تراجم نگاری کا کام باضابطہ طور پر کلیسا کے راہبوں کی نگرانی اور ان کے تعاون سے کیا گیا۔ اسپین میں اس تعلق سے وسیع پیمانے پر کام ہوا کیوں کہ وہاں عیسائی دنیا کا مسلمانوں کے ساتھ بہت زیادہ میل ملاپ رہا اور مذہبی اور علمی کام کرنے کے مواقع بھی بہت تھے۔ قرطبہ کے زوال کے بعد اہلِ کلیسا نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور انھوں نے قرآن کو یورپی زبانوں میں اجتماعی طور پر منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ سنہ ۱۰۵۸ عیسوی میں جب عیسائی فوج نے طلیطلہ Toledo کو فتح کیا تو عیسائی رہنماؤں نے مسلمانوں سے مذہبی تعلقات بڑھانے کے لیے قرآن کے ترجمے کی ضرورت محسوس کی۔ عیسائی راہبوں اور علماء جن میں ڈان ریمنڈو (Don Raymundo)، جان بنڈکٹن (Benedictine) اور پطرس محترم (Peter the Venerable) نے اسکالرز کو عربی کے مختلف متون بالخصوص قرآن مجید کو لاتینی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے منتخب کیا۔[۳]

قرآن کے ترجمے کا کام سب سے پہلے لاتینی زبان میں ہوا تھا۔ لاتینی زبان اس وقت یورپ میں غالب زبان کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کو مذہبی زبان کا درجہ بھی حاصل تھا۔ اس زبان نے یورپ میں کئی صدیوں تک اپنا دبدبہ قائم کر رکھا، اس لیے قرآن اور دیگر اسلامی علوم کے ترجمہ کا کام اس دور میں اسی زبان میں ہوا۔ اہلِ کلیسا کی نگرانی میں لاتینی زبان میں قرآن مجید کا اولین ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس ترجمہ کا بانی راہب پطرس محترم (Peter the Venerable:1092-1156)

---

[۲] محمد حمید اللہ، تراجم قرآن مجید۔ تازہ بتازہ نو بنو، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۸۸ء، ص ۳۸۰۔

[۳] Abdullah Saeed, *The Qur'an: An Introduction* (London And New York: Routledge, 2008, 100.

تھا، جو کلونی (Cluny, France) کا رہنے والا تھا اور وہ تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا متمنی تھا۔[۴] اس نے اسلامی علوم کے تراجم کے لیے مختلف علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جس میں مشہور انگریزی عالم رابرٹ آف کیٹن (Robert of Ketton:1110-1160) بھی تھا۔ رابرٹ بنیادی طور پر مذہبی علوم کے برعکس سائنسی علوم کو لاتینی زبان میں منتقل کرنے کا دلدادہ اور خواہشمند تھا لیکن پطرس نے اس کو قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کے لیے مائل کیا۔ رابرٹ نے بالآخر قرآن مجید کا پہلا لاتینی ترجمہ Pseudoprophete Lex Mahomet کے نام سے کیا یعنی محمد کا قانون جو جھوٹا پیغمبر ہے۔[۵] اس ترجمے کا مقدمہ پطرس نے خود لکھا تھا۔ اس میں پہلی بار اسلام کے بنیادی ماخذ یعنی قرآن مجید کا اللہ کا کلام ہونے سے انکار کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس ترجمے میں بے شمار غلطیاں ہیں۔ پیٹر نے ترجمہ کے علاوہ دو مقالے لکھے ہیں جو اسلامی اور عیسائی نظریے کے تعلق سے ہیں۔ ان میں پیٹر نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ اسلام کو عیسائی روایات کا مجموعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نے قرآن کو محمدی دین قرار دیا اور عیسائی دنیا کو مخاطب ہو کر کہا کہ کیا تم لوگ اسے معمولی سمجھ کر گزر جاؤ گے؟ یا اسے بے ضرر یا معمولی نقصان کے طور پر چھوڑ دو گے[۶]؟ رابرٹ عربی زبان و ادب کا ماہر تھا۔ اس کے علاوہ اس نے کئی اور اہم کتابوں کا ترجمہ کیا۔ رابرٹ نے ترجمہ کرنے میں قدیم تفاسیر اور لٹریچر سے بھی استفادہ کیا جن تک رسائی اس دور میں کافی مشکل تھی۔ اس ترجمے کا غلبہ یورپ اور مغرب میں سترھویں صدی تک رہا اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یورپی دنیا میں اسلامک اسٹڈیز کا اصل آغاز اسی سے ہوا۔ اس ترجمۂ قرآن کی بنیاد نفرت و بغض، دشنام طرازی اور تعصب پر رکھی گئی تھی۔ آتھر جان آربیری اس تعلق سے لکھتا

---

(۴)

Ziad Elmarsafy, *The Enlightenment Qur'an: The Politics of Translation and Construction of Islam*, Chennai: One World Publications,2011, 1۔

(۵)

Hartmut Bobzin, "Translations of the Qur'an", in Jane Dammen McAuliffe (ed.), *Encyclopedia of the Qur'an,* Leiden: Brill, 2006, vol. V, p. 344.

(۶)

Kritze ck, J., Peter *the Venerable and Islam,* Princeton, New Jersey: Princeton University Press, 1964, 8.

ہے: یوں اسلام کی مقدس کتاب کے انگریزی تراجم کا آغاز نہایت بے وقار، ناشائستہ انداز اور معاندانہ نیت کے ساتھ کیا گیا[۷]۔

تاہم رابرٹ کا ترجمہ فوراً شائع نہیں کیا گیا کیوں کہ چرچ کو اس بات کا خوف لاحق ہوا تھا کہ یہ ترجمۂ قرآن مسیحی عوام پر مثبت اثرات مرتب کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ ترجمہ کافی عرصہ کے بعد یعنی ۱۵۴۳ء میں منظر عام پر آیا۔[۸] پرنٹنگ مشین کی ایجاد کے بعد اس کو پروٹسٹنٹ ناشر تھیوڈور بلیانڈر (Theodore Bibliander:1506-1564) نے ۱۵۴۳ء میں ایڈیٹ کر کے بازل میں شائع کیا۔ بلیانڈر نے اس ترجمے میں اضافہ کر کے اسے مزید غلطیوں کا پلندہ بنایا۔[۹] جارج سیل کا کہنا ہے کہ جو کچھ بھی بلیانڈر نے اس میں حذف و اضافہ کیا وہ بالکل اس لائق نہیں رہا کہ اس کو ترجمہ کہا جائے[۱۰]۔

جان آف سیگوویا (John of Segovia: 1395-1458): یا جوآنس الفونسی (Joannes of Alfonsi) پندرہویں صدی کا ایک مشہور راہب اور علم کلام کا ماہر تھا۔ اسے کئی زبانوں میں مہارت تھی۔ اسپین میں کئی عیسائی نسلوں کا سرپرست رہا۔ وہ متأخرین اور معاصر راہبوں کے برعکس دوسرے مذاہب کے تئیں معتدل موقف رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ماتحت بشپس کو قرآن مجید کو بہتر انداز سے سمجھنے اور مسلمانوں سے تعلق پیدا کرنے کے لیے قرآن مجید

---

(۷)

Arthur J. Arberry, *The Koran Interpreted* (New York: George Allen and Unwin, 1995), 7.

(۸)

Ahmed Gumaa Siddiek, Review of Some Orientalists, Approaches used in the Translation of the Holy, in *International Journal on Studies in English Language and Literature* (IJSELL)Volume 6, Issue 4, April 2018, PP 38-53

(۹)

Abdullah Saeed, *The Qur'an: An Introduction* (London And New York: Routledge, 2008), 100.

(۱۰)

George Sale, The Koran: *Commonly Called the Alcoran of Mohammed, Translated into English Immediately from the Original Arabic* (London: L. Hawes, W. Clarke, R. Collins and T. Wilcox, 1764), xi.

کا ترجمہ کرنے پر زور دیا۔ اس کی فرمائش پر ایک عیسائی راہب یی- گدیلی (Yea Gidelli) نے قرآن مجید کا اسپینی زبان میں ترجمہ کیا۔ [۱۱] جان آف سیگویا نے خود بھی قرآن کا قشتالی زبان میں ترجمہ کیا۔ آخری سال اس نے جلاوطنی کی زندگی گزاری جس کے دوران اس نے قرآن مجید کا پہلے اسپینی زبان میں ترجمہ کیا پھر اسی ترجمے کو لاتینی زبان میں منتقل کیا۔ اس ترجمہ کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتی ہیں البتہ اس کے تفسیری حواشی موجود ہیں۔ [۱۲]

پندرہویں صدی کے اختتام پر جوہانس اینڈریس نے عربی سے آراگونین زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا۔ جوہانس اینڈریس والنسیا (بلنسیہ) کا رہنے والا تھا۔ یہ پہلے مسلم تھا، پھر عیسائی ہو گیا۔ جوہانس اینڈریس دراصل مترجم تھا۔ اس نے کئی اسلامی مصادر کا عربی سے آراگونین زبان میں ترجمہ کیا۔ قرآن اور دوسرے مصادر اسلام کا ترجمہ اس نے برشلونہ کے پادری مارٹن گارسیا کے حکم پر کیا تھا۔ اس ترجمہ کے بارے میں جارج سیل کا کہنا ہے کہ یہ ترجمہ شائع ہوا تھا کہ نہیں، اس کے بارے میں کہا نہیں جاسکتا۔ لیکن اس کا پورا کام قرآن کے بارے میں غلط فہمی پھیلانے کا تھا۔ اس نے قرآن کی مخالفت میں ایک مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان انگریزی میں Confusion of Muhamadan Sect and of the Qur'an رکھا گیا ہے۔ یہ مقالہ والنسیا سے ۱۵۱۵ء میں شائع ہوا۔ [۱۳]

آندرے دورے یر (Andre Du Ryer: 1580-1660) ایک معروف فرانسیسی مستشرق تھا۔ وہ ایک ڈپلومیٹ اور ماہر سیاسیات بھی تھا۔ وہ مصر میں فرانسیسی قنصل کی حیثیت

---

(۱۱)

Islamic Literature in Spanish & AljamiadoYga of Segovia His Antecedents & Successors, GeradWiegers (Newyork: E.J. Brill laeiden, 1994), 23-

(۱۲)

Abdelahab El-Alffendi, *About Muhammad: the Other Western Perspective on the Prophet of Islam* (U.k: Leagacy Publishing Ltm. Richmond, Surry, 2013), XXIV.

(۱۳)

George Sale, *The Koran: Commonly Called the Alcoran of Mohammed*, Translated into English Immediately from the Original Arabic (London: L. Hawes, W. Clarke, R. Collins and T. Wilcox, 1764), xi.

سے بھی تعینات رہا۔ آندرے دوریے عربی، ترکی اور فارسی زبانوں کا ماہر تھا۔[۱۴] اور اس نے عربی اور فارسی کی کئی کتابوں کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا جن میں شیخ سعدی کی کتاب "گلستان سعدی" بھی شامل ہے۔ وہ مشرقی زبانوں کا ماہر تھا، اسی لیے بادشاہ لوئس ثالث عشر کے ساتھ مشرقی زبانوں کے ترجمان کی حیثیت سے بھی کام کیا تھا۔ اس نے ۱۶۴۷ء میں فرانسیسی زبان میں قرآن پاک کا L'Alcoran de Mahomet کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ اس نے کلیسا کی نگرانی میں کیا اور اس وقت وہ مصر میں فرانسیسی کونسلیٹ میں کام کر رہا تھا۔ یہ ترجمہ اس نے براہِ راست عربی زبان سے نہیں کیا[۱۵] بلکہ کسی لاتینی ترجمۂ قرآن سے کیا تھا۔ یہ ترجمہ اگرچہ رابرٹ آف کیٹن کے ترجمۂ قرآن سے بہتر تھا لیکن پھر بھی غلطیوں سے محفوظ نہ تھا۔ اس ترجمے میں بہت غلطیاں ہیں اور حذف و زیادتی کی ایسی خرابیاں ہیں جو قابل معافی نہیں ہیں۔[۱۶] اس نے اس ترجمہ کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہا کہ قرآن مجید محمد ﷺ کی ذاتی کاوش ہے۔ اس نے سورتوں اور آیات کی روایتی تقسیم کو بھی نظر انداز کیا۔[۱۷] جارج سیل نے بھی اس ترجمہ کو غلطیوں کا مجسمہ قرار دیا ہے۔ اس ترجمے کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے مغربی اور یورپی زبانوں میں بڑے پیمانے پر قرآن مجید کے مزید ترجمے کیے۔ سب سے پہلے الیگزنڈر راس نے اس سلسلے کا آغاز کیا اور اس ترجمے کو

---

(۱۴)

Ahmed Gumaa Siddiek, *Review of Some Orientalists' Approaches used in the Translation, of the Holy Quran*, in International Journal on Studies in English Language and Literature (IJSELL), 23. Volume 6, Issue 4, April 2018, PP 38-53۔

(۱۵)

Ziad Elmarsafy, *The Enlightenment Qur'an: The Politics of Translation and Construction of Islam*, 7.

(۱۶) حافظ خدا بخش، یورپ اور قرآن، مشمولہ قرآن نمبر، سیارہ ڈائجسٹ، جلد: ۱۴، شمارہ: ۴، اپریل ۱۹۷۰، ۳۳۹۔

(۱۷)

Nabil Matar, Andre du Ryer and Oriental Studies in Seventeenth-Century France (review)
https://www.researchgate.net/publication/265759058-Andre-du-Ryer-and-Oriental-Studies-in-Seventeenth-Century-France-review

انگریزی زبان میں منتقل کیا۔[۱۸]

لوئس مراکی(Louis Maracci:1612-1700) اٹلی کا ایک مشہور مستشرق تھا۔ وہ ۱۶۱۲ء میں لوکا کے صوبے میں پیدا ہوا اور ۸۸ سال کی عمر ۱۷۰۰ء کو روم میں انتقال کر گیا۔ مراکی بنیادی طور پر ایک عہد نامۂ قدیم کا اسکالر تھا اور روم میں کالج آف وزڈم کے شعبۂ مشرقی علوم وادب میں استاذ کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا تھا۔ مراکی مشرقی زبانوں کا ماہر تھا۔ چرچ کے ساتھ اس کا گہرا تعلق تھا اور وہ کلیسا کے کئی اہم مناصب پر فائز بھی رہا۔ وہ ترجمہ نگاری کا ماہر تھا۔ عربی بائبل کو اسی نے ایڈیٹ کر کے ۱۶۷۱ء میں روم میں شائع کیا۔ اس نے قرآن مجید کا لاتینی زبان میں مناظرانہ نوعیت کا ترجمہ کیا، جو ۱۶۹۸ء میں *Alcorani-Textus Univrsus Arabice et latin* کے عنوان کے تحت پڈوا(Padua) میں شائع کیا۔[۱۹] یہ اس کی چالیس سالہ زندگی کا خلاصہ تھا۔ یہ ترجمہ عربی متن کے ساتھ شائع کیا گیا اور اس میں تفسیری حواشی بھی ہیں۔ نیز عربی تفاسیر کے اقتباسات بھی حوالے کے طور پر دیے گئے ہیں۔ یہ ترجمہ تعصب سے بھرا ہوا ہے اور اس میں جگہ جگہ تحریف اور بے جا تاویل کی گئی ہے۔ اس ترجمہ کا مقصد قرآن کی تصویر بگاڑنا تھا۔ غرض کہ یہ ترجمہ بھی استشراقی فکر کا نمائندہ اور آئینہ دار تھا۔ اسی ترجمہ کو بعد میں ڈیوڈ نیریٹر (David Nerreter) نے جرمن زبان میں منتقل کیا جو نورنبرگ میں ۱۷۰۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اس کو کئی یورپی زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ جارج سیل نے ترجمے کا اسلوب مراکی کے ترجمے سے ہی اخذ کیا[۲۰] بلکہ اس نے اپنے ترجمے کی بنیاد مراکی کے ترجمے کو بنایا۔

---

(۱۸)

Mohammad Khalifa, *The sublime Qur'an and Orientalism* (Karachi: International Islamic Publishers, 1989), 63.

(۱۹)

Ziad Elmarsafy, *The Enlightenment Qur'an: The Politics of Translation and Construction of Islam*, 11.

(۲۰)

Muhammad Feroz-ud-Din Shah, *Orientalistic Research Methodology towards the Qur'anic Text* (Analytical Study), PhD Thesis, Lahore: Department of Islamic Studies, University of Panjab, 2005, 119.

الیگزینڈر راس(Alexander Ros:1590-1654): اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔ راس ۱۵۹۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۵۴ء میں انتقال کیا۔ اس کا شمار مستشرقین کے صف اول میں ہوتا ہے۔ راس نے تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے قرآن مجید کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس نے یہ ترجمہ ۱۶۴۹ء میں فرانسیسی ترجمۂ قرآن سے کیا تھا اور اس کا عنوان The Alcoran of Mahomet translated out of Arabique into French by the Sieur Du Ryer رکھا۔ اس نے کتاب کے طویل عنوان میں کہا ہے کہ اس کے ترجمے کا مقصد ہر اس شخص کی خواہش کو پورا کرنا ہے جو ترکوں (مسلمان) کے باطل غرور کو دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ ترجمہ در اصل اس نے آندرے دورے یر (Du Rayer: 1580-1660) کے فرانسیسی ترجمے سے کیا ہے جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ اسلام کی مخالفت سے یہ ترجمہ بھرا پڑا ہے۔ سیل نے بھی لکھا ہے کہ راس کا انگریزی ترجمہ قرآن خاصا کمزور اور بے کار ہے۔ راس نہ ہی عربی زبان کا ماہر تھا اور نہ ہی فرانسیسی زبان پر مکمل دسترس رکھتا تھا۔ اس نے اس ترجمہ میں مزید غلطیوں کا اضافہ کیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں عیسائیوں کو راغب کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے اور اس لیے یہ پڑھنا خطرناک نہیں ہے۔ ترجمے کے تعلق سے راس کی نیت درست نہیں تھی، اسی لیے اس میں بے شمار غلطیاں کر بیٹھا۔ اس نے قرآن مجید کو نبیؐ کی تصنیف قرار دیا، نیز لوگوں کو قرآن سے درپیش "خطرات" سے بھی آگاہ کیا گیا۔[۲۱]

وہ اپنے ترجمے کے مقدمے میں مسلمانوں کے بجائے "ترکی قرآن" کے لفظ سے آغاز کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اہل ترک (مسلمان) ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ اس نے حضرت محمدؐ کے نام کو بھی بگاڑ کر لکھا ہے اور محمد کے بجائے ماہومٹ (Mahomet) اور شریعتِ اسلامی کو "محمدی قانون" (Muhamadan Law) لکھا ہے۔[۲۲] کئی مستشرقین نے اس ترجمۂ قرآن پر تنقید کی۔ اس ترجمے کو مرکزی توجہ اس لیے دی گئی کہ یہ انگریزی کا پہلا ترجمہ تھا اور اٹھارہویں

---

(۲۱) Alexander Ross, *The Alcoran of Mahomet* (London: Printer Randal Taylor, 1688 (Ross, Alexander) http://en.wikisource.org/wiki/Ross, Alexander_%7=6 :> 9-1654%29 %28DNB00%29. (as accessed on April. 04, 2024)

(۲۲) ماخذ سابق۔

صدی میں انگریزی زبان عالمگیر حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ اس کے علاوہ اہل کلیسا بھی قرآن مجید کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے، اس لیے لاتینی اور فرانسیسی زبان کے بعد فوراً انگریزی زبان میں ترجمہ قرآن کا اہتمام کیا گیا۔

جارج سیل(George Sale:1697:1736): اٹھارہویں صدی میں انگریزی قانون دان جارج سیل نے قرآن مجید کا دوسرا ترجمہ کیا۔ اس نے قرآن کا ترجمہ براہ راست عربی سے کیا۔ جارج سیل ۱۶۹۷ء کو کینٹ (برطانیہ) میں پیدا ہوا۔ اس نے قانون اور عربی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی۔ لندن کے Society for promoting Christian Knowledge نے اسے اپنا رکن منتخب کیا اور عہد نامۂ جدید کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا کام تفویض کیا۔ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد مذکورہ ادارے نے اسے قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کا کام سونپ دیا جو اس نے چند سالوں میں مکمل کیا۔ اس ترجمے کو پڑھ کر مغربی دنیا کی ایک بڑی تعداد قرآن مجید سے متعارف ہوئی۔ یہ ترجمہ اس نے ۱۷۳۴ء میں The Koran: Commonly called the Alkoran of Mohammad کے نام سے شائع کیا جو ۲۰۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس ترجمے کے سرورق پر یہ تعارف پیش کیا گیا ہے:

Translated into English from the original Arabic with explanatory notes taken from the most approved commentaries.[۲۳]

(اصل عربی سے انگریزی میں ترجمہ کیا گیا، ان توضیحی حواشی کے ساتھ جو معتبر ترین تفاسیر سے ماخوذ ہیں)۔

اس میں جارج سیل نے آغاز میں حضرت محمد ﷺ کی سیرت، اسلامی تاریخ، فقہ اور کلام پر بحث کی۔ اس نے اس ترجمے میں بار بار یہ ثابت کرنا چاہا کہ قرآن مجید حضرت محمدؐ کا کلام ہے۔ سیل اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پیش نظر کوئی مشنری مقصد اور کوئی غلط ارادہ نہیں ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میرے خیال میں ترجمے کی اشاعت کے لیے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنا

---

(۲۳)

George Sale, *The Koran: Commonly Called the Alcoran of Mohammed*, Translated into English Immediately from the Original Arabic, xi.

ضروری نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قرآن کو Manifest a Forgery یعنی واضح جعلسازی بھی قرار دیتا ہے۔ سیل کی غلط ترجمانی کی بنیاد پر انگریزی زبان میں مستشرقین اور بعض مغربی مصنفین نے نہ صرف قرآن کی صحیح اور درست ترجمانی نہیں کی بلکہ اس مناظرانہ روایت کو مزید ترقی دی۔ [۲۴] مغربی اور یورپی دنیا میں جارج سیل کا ترجمہ اتنا مشہور ہوا کہ بعد میں عیسائی مترجمین نے سیل کے ترجمے کو بنیاد بنایا۔ تھیوڈور آرنالڈ (Theodor Arnold:1761-1787) نے قرآن مجید کا ایک جرمن ترجمہ لائپ زیگ سے ۱۷۳۶ء میں شائع کیا۔ اس ترجمے کی بنیاد سیل کے ترجمے پر رکھی گئی۔ قرآن کریم کے روسی ترجمے کو الیگزی ویسل جیوک کوماکوف (Alexj Vasil Jevickolmakov) نے سینٹ پٹرسبرگ سے شائع کیا۔ اس کی بنیاد بھی سیل کے ترجمۂ قرآن پر رکھی گئی۔ سیل کے ترجمے کو ۱۸۵۴ء میں ہنگری زبان میں بھی اسٹانز کولی (Istanszkoli:1882-1904) نے کیا۔ اس کے بعد ۱۷۴۲ء میں ڈچ، ۱۷۵۰ء میں فرانسیسی اور ۱۸۱۴ء میں سویڈش زبانوں میں ترجمے کیے گئے۔ [۲۵] سیل کے ترجمۂ قرآن کے ۱۶۰ سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور صرف امریکہ میں اس کے ۶۷ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ [۲۶]

تھیوڈور آرنالڈ (Theodor Arnold: 1683-1771): جرمنی کا رہنے والا تھا۔ وہ یونیورسٹی آف لائپزیگ میں استاذ بھی رہا۔ وہ انگریزی اور جرمن زبان وادب کا ماہر تھا۔ اس نے کئی اہم انگریزی اور جرمنی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اس نے قرآن مجید کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا جو لائپزیگ سے ۱۷۴۶ء میں شائع ہوا۔ اس ترجمے کی بنیاد جارج سیل کے ترجمے پر رکھی گئی۔ [۲۷]

گستاؤ فلوگل (Gustav Flugel :1802-1872): انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں دو زبانوں میں ایک نیا ترجمہ منظر عام پر آیا جس کو مشہور جرمن محقق اور مستشرق گستاؤ فلوگل نے

---

[۲۴] ماخذ سابق۔

[۲۵] محمد سلطان شاہ، حافظ خورشید احمد قادری، جارج سیل کے ترجمہ کا تنقیدی جائزہ، ابحاث، جلد: ۲، شمارہ ۱۸، (اکتوبر-دسمبر ۲۰۱۷)، ص: ۳۲۔

[۲۶] Sadique Mansuri, English *Translations of the Qur'an: Problems and limitations* (Ujjain: Vindhyan Bloom Publications, 2013), 87.

[۲۷] *Ibid,* 87.

کیا۔ گستاؤ نے مذہبی علوم اور فلسفہ پڑھنے کے بعد مشرقی زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ اس نے عربی، ترکی اور فارسی کے کئی مخطوطات پر تحقیقی کام بھی کیا۔ اس نے قرآن کا ترجمہ Corani Textus Arabicae کے عنوان سے ۱۸۳۴ء میں کیا۔ اس نے یہ کام مشنری مقصد کے تحت کیا۔ اس ترجمہ کے ذریعے ابہام اور شکوک و شبہات پیدا کیے گئے۔ اس ترجمے کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس نے قرآن کی سورتوں اور آیتوں کی نئی تعداد ایجاد کی۔[۲۸]

ای-ایچ-پالمر(E.H. Palmer :1840-1882): کیمبرج اسکالر ایڈورڈ ہنری پالمر ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا۔ وہ عربی، فارسی، اردو اور ترکی کا ماہر و مترجم تھا۔ وہ ایک ادیب اور علوم اسلامیہ کا ماہر تھا۔ اس نے کیمبرج یونیورسٹی کے شعبۂ عربی زبان وادب میں تدریسی کام کیا۔ اس نے مشرق وسطی کا ایک طویل دورہ کر کے عربی مخطوطات کا جائزہ لیا نیز ترجمہ کا کام بھی کیا۔ اس نے مصری شاعر بہاء الدین زُہیر کے ادبی کام کو انگریزی زبان میں منتقل کیا۔[۲۹] پالمر نے ۱۸۸۰ء میں قرآن کا انگریزی ترجمہ The Qur'an کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کام کے لیے پالمر کو بنیادی طور پر میکس مولر (Max Muller) نے آمادہ کیا۔ پالمر کے ترجمے سے قرآن کی تصویر میں بہت بڑی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ متن کی تفہیم کو مفید بنانے کے لیے پالمر نے آغاز میں ہر سورہ کا تعارف تلخیص (Abstract) کے نام سے پیش کیا ہے۔ نیز منفی انداز میں ترجمے کے آغاز میں پیغمبرِ اسلام کی زندگی کی تاریخ پر ایک تعارف لکھا۔ بعض مستشرقین کے برعکس پالمر نے روایتی ترتیب کو برقرار رکھا ہے۔ وہ اپنے قارئین کو جارج سیل کے ترجمے سے بھی رجوع کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ پالمر کے ترجمۂ قرآن میں ترجمہ کے ساتھ مختصر حواشی بھی ہیں۔ پالمر اس ترجمہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ قرآن کا ترجمہ کرنا نہایت مشکل کام ہے اور میں نے اس میں بھرپور ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ دونوں زبانوں کے ذوق اور ادبی چاشنی پر

---

(۲۸)

Gustav Flügel, *Corani texts arabicus, sumtibus E. Bredtii*, 1881. https://archive.org/details/coranitextusara00flgoo (as accessed on June. 03, 2024).

(۲۹)

Sadique Mansuri, English *Translations of the Qur'an: Problems and limitations* (Ujjain: Vindhyan Bloom Publications, 2013), 79.

کوئی فرق نہ پڑے البتہ بعض جگہوں پر الفاظ کے معنی پر ہی اکتفا کیا ہے۔ پالمر کا ترجمہ راڈویل اور جارج سیل کے تراجم کے مقابلے میں واضح ہے، لیکن اس میں ربط کی کمی ہے۔[۳۰]

جے-ایم-راڈویل(J.M.Rodwel:1808-1900): فکرِ عیسائیت کا ایک مشہور علمبردار تھا۔ مشرقی زبانوں پر اسے خاص عبور حاصل تھا اور وہ کہنہ مشق مترجم بھی تھا۔ وہ چرچ آف انگلینڈ میں پادری تھا۔ وہ برطانیہ میں کئی اہم تعلیمی اداروں کے اہم عہدوں پر فائز رہا اور کلیسائی مشن کی آبیاری کے لیے ہر وقت نہایت متحرک رہتا تھا۔ اسلامی علوم پر اس کو دسترس تھی۔ اس نے قرآن مجید کا ترجمہ EL-Kor'an, Translated from the Arabic, The Suras Arranged in Chronological order, with notes and Index کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۶۱ء میں لندن میں شائع ہوا۔ مغربی دنیا میں اس کے پچاس سے زائد ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ آربیری اور این-جے-داوؤد کے تراجم سے قبل کافی مقبول ترجمہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہ بھی مناظرانہ قسم کا ترجمہ ہے۔ اس نے اس میں قرآن کے تاریخی اور ارتقائی عمل کو ایک مفروضہ قرار دیا ہے۔ اس نے قرآن کو مشکل ترین کتاب قرار دیا جو اپنا مواد حیرت انگیز انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ مقدمہ میں لکھتا ہے:

> .....اس کتاب کا موضوعِ بحث پیچیدہ ہے اور اس کی زبان جذباتیت سے لبریز ہے، سورتوں (ابواب) کی ترتیب میں مواد اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ جو لوگ پہلے سے اس کتاب سے آگاہ نہیں ہوتے تو وہ اکثر اسے الجھا ہوا پاتے ہیں..... اس تصنیف کا پس منظر انگریزی بولنے والے کے لیے نہایت اجنبی ہے[۳۱]

راڈویل پہلا مستشرق تھا جس نے قرآنی سورتوں کو تاریخ کے مطابق ترتیب دیا۔ مثلاً سورۃ الفاتحہ قرآن مجید کی پہلی سورۃ ہے جب کہ راڈویل نے اس کو اپنے ترجمۂ قرآن مجید میں

---

(۳۰)

E.H. Palmer, *The Qur'an, Oxford Clarendon press*, 1880, p: 75, https://quran-archive.org/explorer/edward-palmer. (as accessed on june. 03, 2024)

(۳۱)

M. Rodwel, The Koran, 2. https://archive.org/details/TheKoranTranslatedByRodwell/page/n1/mode/2up (as accessed on june. 04, 2024).

آٹھویں نمبر پر رکھا ہے۔ سورۃ البقرہ دوسرے نمبر پر ہے جب کہ راڈویل نے اس کو نویں نمبر پر رکھا، سورۃ آل عمران ترتیب کے مطابق قرآن کی تیسری سورت کہلاتی ہے جب کہ راڈویل نے مذکورہ سورہ کو ترتیب میں اکیانویں نمبر پر رکھا ہے۔ سورۃ النساء قرآن کی چوتھی سورت ہے لیکن اس کے ترجمے میں سورۃ النساء کو سوویں سورت کے طور پر رکھا گیا۔ راڈویل نے بھی سابقین کی طرح قرآن مجید کو محمد ﷺ کا کلام قرار دیا ہے۔[۳۲] وہ پیغمبر اسلام کو "قرآن کا چالاک مصنف" The crafty author of the Qur'an قرار دیتا ہے۔ مغربی دنیا میں اس ترجمے سے کافی استفادہ کیا گیا۔ اس نے قرآن کے ترجمے میں لغوی ترجمانی کرنے کی کوشش کی۔

ریچرڈ بیل (Richard Bell:1876-1952): بیسویں صدی کے آغاز سے مستشرقین نے تراجم قرآن کی تحریک کو مزید آگے بڑھایا اور کئی تراجم قرآن منظر عام پر آگئے لیکن ان تراجم کے مقاصد بھی وہی ہیں جو پہلے سے چلے آرہے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ ہر دور میں قرآن مجید اور اس کی تعلیمات سے پریشان ہیں۔ اس سلسلے میں پہلا ترجمہ ریچرڈ بیل کا ہے۔ جو ایک مشہور مفکر اور مستشرق تھا۔ بیل علوم اسلامیہ اور مشرقی زبانوں کا ماہر تھا۔ وہ یونیورسٹی آف ایڈنبرہ میں عربی زبان وادب کا پروفیسر رہا۔ کلیسا سے بھی اس کا تعلق تھا۔ عربی و اسلامی افکار و علوم اور قرآن مجید کو تنقیدی اعتبار سے پیش کرنا اس کا خاص میدان تھا۔ اس کا ترجمۂ قرآن ۱۹۳۷ء میں دو جلدوں میں شائع ہوا۔ اس ترجمے میں بھی جانب داری اور تعصب سے کام لیا گیا ہے۔ قرآنی سورتوں کی جو توقیفی ترتیب ہے، بیل نے اس ترتیب کو رد کر کے خود ساختہ ترتیب میں پیش کیا۔

آرتھر جان آربری (Arthur John Arberry: 1905-1969): برطانیہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے ۱۹۲۴ء میں پیمبروک کالج کیمبرج سے گریجویشن کیا۔ وہ انڈیا آفس، لندن میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک اسسٹنٹ لائبریرین رہا اور مشرقی وسطی میں کئی سال گزارنے کے بعد اس نے عربی اور فارسی زبان میں مہارت حاصل کی۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں شعبۂ عربی زبان

---

(۳۲)

J. M. Rodwel, *The Koran,*1-2.
https://archive.org/details/TheKoranTranslatedByRodwell/page/n1/mode/2up (as accessed on June. 04, 2024).

وادب میں پروفیسر کے عہدے پر بھی فائز رہا۔ اس نے ساٹھ کتابیں لکھیں اور قرآن کا براہِ راست عربی سے ترجمہ بھی کیا۔ اس کا ترجمۂ قرآن پہلی بار ۱۹۵۵ء میں The Koran Interpreted کے عنوان سے نیو یارک میں چھپا جو کافی مقبول ہوا۔ اس کی اشاعت کا سلسلہ ابتک جاری ہے۔ آربیری قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت اور اس کے صوتی آہنگ کا زبردست قائل تھا اور اس کا لحاظ اس نے ترجمے میں بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ آربیری نے اپنے ترجمۂ قرآن میں عمدہ اسلوب اور بلیغ زبان استعمال کی جس نے اس کی اہمیت کو دوبالا کر دیا۔ زبان وبیان کی فصاحت کے لحاظ سے دوسرے مستشرقین کے مقابلہ میں یہ معیاری ترجمہ ہے۔ آربیری کا ماننا ہے کہ قرآن کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا ہے، اس کی ہم ترجمانی ہی کر سکتے ہیں۔ یہ وہی مؤقف ہے جو ترجمہ کے تعلق سے مسلم اسکالرز رکھتے ہیں۔ یہ ترجمہ ٹھیک ٹھاک ہے اور تعصب سے بھی پاک ہے اسی لیے مسلم اسکالرز نے اس کو کافی سراہا۔ آربیری دوسرے مستشرقین کی طرح قرآن کو محمد ﷺ کا کلام قرار نہیں دیتا ہے بلکہ اس کا مؤقف یہ ہے کہ قرآن کسی ما فوق الفطرت ہستی Supernatural کا کلام ہے۔[۳۳] ماہر قرآنیات احمد گوما صدیق نے آربری کے ترجمۂ قرآن کا تنقیدی جائزہ لیا اور انھوں نے اس میں تقریباً دو سو کے قریب غلطیوں کی نشاندہی کی ہیں۔ مثلاً النبی الأمی کا ترجمہ آربیری نے The Prophet of the Common folk کیا ہے جب کہ اس کا صحیح ترجمہ The Prophet who is illiterate ہے[۳۴]۔ اسی طرح سے آربری نے کئی جگہوں پر آیات کے ٹکڑوں کا غلط ترجمہ کر ڈالا جیسے مشہور آیت يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ کا ترجمہ اس نے یہ کیا: binding them to honour

---

(۳۳)

https://archive.org/details/in.gov.ignca.4296 (as accessed on June. 04, 2024)

(۳۴)

Ahmed Gumaa Siddeik, A Critical Reading of A. J. Asberry's Translation of the Meanings of the Holy Quran (Koran Translated) International Journal on Studies in English Language and Literature (IJSELL) Volume 6, Issue 5, May2018, PP 46-62ISSN 2347-3126 (Print) & ISSN 2347-3134 (Online) http://dx.doi.org/10.20431/2347-3134.0605007www.arcjournals.org (as accessed on March. 07, 2024).

and forbidding them the dishonour [۳۵] جو درست ترجمہ نہیں ہے۔

این-جے-داؤد(N.J.Dawood:1927-2014): داؤد بغداد (عراق) کا رہنے والا تھا۔ وہ ۱۹۲۷ء کو بغداد کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں اس کو بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے لیے عراق کی حکومت نے اسکالرشپ دیا۔ اس نے برطانیہ میں لندن یونیورسٹی سے انگریزی اور عربی زبان و ادب میں بی-اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے کئی اہم عربی کتابوں کا ترجمہ کیا جن میں 'مقدمہ ابن خلدون' اور مشہور عربی ناول 'الف لیلہ' بھی شامل ہے جنہیں پرسٹن یونیورسٹی نے شائع کیا۔ اسے عربی اور انگریزی دونوں زبانوں پر مہارت حاصل تھی۔ وہ ترجمہ نگاری کے فن سے بھی بھرپور واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے انگریزی دان طبقہ کے لیے ایک نیا ترجمہ The Koran With Parallel Arabic Text کے نام سے کیا جو زبان، ادب اور اسلوب کے اعتبار سے سابقہ ترجموں سے بہتر ہے۔ بدقسمتی سے یہ ترجمہ بھی تعصب کی نگاہوں سے کیا گیا کیوں کہ اس نے آغاز ہی میں اس بات کا اظہار کیا کہ کس طرح سے حضرت محمد یہودی اور عیسائی تعلیمات سے متأثر تھے اور حضرت محمد جنگ و جدل اور تشدد کے داعی تھے۔ یہ بھی ایک گمراہ کن ترجمہ ہے۔ داؤد نے بھی آغاز میں قرآن مجید کی سورتوں کو ترتیب نزولی میں پیش کیا لیکن بعد میں درست ترتیب کے مطابق اپنے ترجمۂ قرآن کو شائع کیا اور اس کے سرورق پر لکھا کہ یہ ایڈیشن قرآنی سورتوں کی اصل ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ [۳۶] یہ ترجمہ ۱۹۵۰ء سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ داؤد قرآن مجید کو انسان کی ذہنی پیداوار قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنی طرف سے حواشی لکھنے کا اہتمام نہیں کیا بلکہ اپنے ترجمے میں زمخشری اور بیضاوی کے تشریحی حواشی شامل کیے ہیں۔ [۳۷]

ایلن جانز(Alan Jones:1933-) : عربی، ترکی اور فارسی زبان و ادب کا ماہر تھا۔ اس کے

---

(۳۵) A. J. Arberry, Koran interpreted, Vol: I, (London: Goerge Allen and Unwin ltd. 1955), p: 89.

(۳۶) Alan Jones, *The Koran: with a parallel Arabic text* (London, New York and USA: Penguin Books: 1997), 2.

(۳۷) Alan Jones, *The Koran: with a parallel Arabic text*, 2.

علاوہ ترجمہ نگاری پر بھی اسے دسترس تھی۔ اس نے گریجویشن ۱۹۵۵ء میں کیمبرج سے کی اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں ۱۹۵۷ء سے یعنی ۴۳ سال بحیثیت لکچرر عربی زبان وادب کی خدمت کرتا رہا۔[۳۸] جاہلی شاعری پر مبنی دو کتابوں کا اس نے انگریزی میں ترجمہ کیا جن میں سے پہلی کتاب کا نام Early Arabic Poetry اور دوسری کتاب کا نام Early Arabic Poetry: Select Poems ہے۔ اس نے چالیس قرآنی اسباق پر مشتمل Arabic Through the Qur'an کے نام سے کتاب لکھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے سبک دوشی کے بعد اس نے The Qur'an Translated into English کے نام سے قرآن مجید کو عربی زبان سے براہِ راست ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کو گب میموریل ٹرسٹ نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔[۳۹] الین جانز نے ترجمہ قرآن میں حد سے زیادہ بددیانتی اور ناانصافی سے کام لیا ہے۔ اس کی بددیانتی کی انتہا یہ ہے کہ اس نے قرآن مجید کو عیسائی اور یہودیوں کے مذہبی مصادر سے مستعار شدہ کتاب قرار دیا ہے۔ اس نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ قرآن مجید کے جمع وتدوین پر اعتراضات کیے۔ جانز نے قرآن مجید میں جگہ جگہ ابہام اور شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔

اپنے ماقبل مستشرقین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے۔ جانز بعض جگہ خود ساختہ ترجمہ کر دیتا ہے۔ مثلاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ اس طرح کرتا ہے: In the name of God, the Father Almighty اس جملے میں دوسرا ٹکڑا زائد ہے اور غلط بھی۔[۴۰]

---

(۳۸)

Islamic Reflections Arabic Musings Studies in Honor of Alan Jones, Edited by: R.G Holland and P.F.Kennedy (The E.J.W. Gibb Memorial Trust, 2004), 1.

(۳۹)

Alan Jones (1933–2021), Journal of Modern Jewish Studies Volume 20, 2021, Issue 4: Between Judaism and Islam: A Special Issue of JMJS in Honor of Samuel Miklos Stern (1920-1969) mehttps://www.tandfonline.com/doi/full/10.1080/14725886.2021.1989153 (as accessed on March. 07, 2024).

(۴۰)

Hilary Kilpatrick, *The Qur'an. Translated into English by Alan Jones Article in Die Welt des Islam's*. July 2011 https://www.researchgate.net/publication/261976755 (as accessed on March. 7, 2024).

تراجم قرآن کے تعلق سے مستشرقین کا منہج: اس کا خلاصہ ہم یوں کر سکتے ہیں:

- تراجم قرآن کے سلسلے میں مستشرقین نے کوئی ٹھوس یا معقول منہج اختیار نہیں کیا اور نہ ہی کوئی اصولی موقف منتخب کیا۔
- غیر علمی اور غیر منطقی طرز استدلال اختیار کیا۔
- ہر جگہ تعصب اور جانب داری سے کام لیا۔
- قرآن مجید کو اللہ کا کلام قرار دینے سے انکار کیا اور اس سلسلے میں معروضیت سے کام لیا۔
- قرآن مجید کے پیغام کو مسخ کرنا اپنا حقیقی مشن بنائے رکھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے قرآن کے اصل متن سے انحراف کیا۔
- عربی زبان پر پکڑ نہ ہونے کی وجہ سے قرآنی متن کے ترجمے میں بہت ساری غلطیاں درآئیں۔
- تراجم قرآن کے تعلق سے ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کو بشری کلام ثابت کیا جائے۔

مذکورہ تراجم مغربی دانشوروں اور مصنفین کے لیے مصادر اور مراجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بنیادی طور پر ان تراجم میں اسلام اور قرآن کا رد کیا گیا ہے جیسا کہ ولیم سیموئل لکھتے ہیں کہ:

All of these Western translations were done to expose and refute Islam and the Qur'an. (۴۱)

(یہ تمام مغربی تراجم اسلام اور قرآن کو بے نقاب کرنے اور اس کی تردید کرنے کے مقصد سے کیے گئے تھے)۔

مستشرقین کے تراجم کا مختصر جائزہ : یہ تمام تراجم مناظراتی نوعیت کے ہیں۔ ان تراجم میں قرآن مجید کے ساتھ انتہائی ناانصافی کی گئی ہے۔ مستشرقین نے قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کو اپنے دلچسپی کا مرکز بنایا۔ بعض لوگ وہ بھی ہیں جنھوں نے تراجم کے ذریعے سے یہ باور کرانے کی

---

(۴۱)

William Samuel Peachy, *English Translations of The Qur'an and the roles of Why, By Whom, For Whom and How*, December 2013, https://www.researchgate.net/publication/311734907 (accessed on May 3, 2024).

مذموم کوششیں کیں کہ قرآن مجید محمد ﷺ کا اپنا کلام ہے۔ بعض لوگ وہ بھی ہیں جو قرآن مجید کا مصدر یہودیت و عیسائیت کی مذہبی کتابوں کو قرار دیتے ہیں اور علی الاعلان اس مفروضے کو پیش کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا مصدر و منبع بائبل ہے۔ مستشرقین کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جو قرآن مجید کی لسانی، ادبی اور اس کے اعجاز پر اعتراضات اٹھانے کے لیے ترجمہ نگاری کا کام کرتے ہیں۔ مستشرقین نے ان تراجم میں مشترکہ طور پر یہ مؤقف پیش کیا ہے کہ قرآن مجید کا نہ کوئی وجود ہے اور نہ ہی اس کی کوئی حیثیت ہے۔ ان کے نزدیک قرآن مجید بائبل سے ماخوذ ایک ملغوبہ ہے جس کا حقیقی دنیا میں کوئی کردار نہیں ہے اور نہ ہی اس کی تعلیمات میں کوئی جان ہے۔ انھوں نے ان تراجم میں جگہ جگہ الٰہی تعلیمات کو مسخ کرنے کی مذموم کوششیں کیں اور ہر جگہ قرآنی تعلیمات کے ساتھ استہزا کا معاملہ کیا۔ ان میں بہتان تراشی، تحریف و غلط تاویل، کذب بیانی اور طعن و تشنیع، شکوک و شبہات پیدا کرنے کی ہر طرح کی کوششیں کی گئیں۔ نیز خوش نما اور دلچسپ اسلوب میں ان تراجم کے ذریعے دنیائے انسانیت کو گمراہ کرنے کی ہر ممکن سعی کی گئی جس کے نتیجے میں اہل یورپ و مغرب ان ہی تراجم کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان ہی تراجم پر انحصار کر کے اپنی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ ان تراجم پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف مصنف ڈاکٹر عبد اللہ سعید لکھتے ہیں:

> اسلام اور قرآن پر ابتدائی تصانیف کے تراجم بڑی حد تک مناظرانہ نوعیت کے تھے۔ یہ تراجم ایسے ماحول میں کیے گئے جہاں عیسائی اور مسلمان اپنے اپنے مذاہب کی برتری ثابت کرنے کے لیے ایک دوسرے سے برتری اور مسابقت کر رہے تھے، نیز ایک دوسرے کے مذہب کی مبینہ عدمِ صداقت کو اظہار کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ کئی عیسائی علما کو امید تھی کہ وہ ایسے تراجم کے ذریعے اسلام کی تردید کر سکیں گے جن کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ قرآن ایک من گھڑت دستاویز ہے جسے محمدؐ نے عیسائیت اور یہودیت سے اخذ کیا ہے۔ (۴۲)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مستشرقین اور عیسائی مترجمین نے ان ترجموں میں نہ صرف نظریاتی طور سے طفلانہ حرکت اور غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا بلکہ ان تراجم میں زبان و ادب یا فنی اعتبار سے بھی لاتعداد کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر مسلم اسکالرز یا مترجمین نے

---

(۴۲) Abdullah Saeed, *The Qur'an: An Introduction* (Routledge, London And New York, 2008), 104.

قرآن مجید کے تراجم کے سلسلے کا آغاز کیا۔ اس تعلق سے ماہر قرآنیات حسین عبد الرؤف لکھتے ہیں:

> ان غیر مسلم مترجمین کی جانب سے، دانستہ یا نادانستہ طور پر، اسلام کی شبیہ کو پہنچنے والے نقصان کی مقدار نے مسلم اہلِ قلم کو اس چیلنج کو قبول کرنے پر آمادہ کیا اور انہوں نے مغربی زبانوں، خصوصاً انگریزی میں قرآن کے تراجم کیے۔ (۴۳)

مستشرقین نے قرآن مجید کے تئیں اول دور ہی سے دلچسپی دکھائی لیکن انھوں نے کبھی بھی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی طور پر بھی انہوں نے قرآن مجید کو اپنا موضوع بنا کر تعصب اور منفی رخ سے کام کرنا شروع کیا۔ یہ بات واضح رہے کہ مترجم کو دونوں زبانوں کو سمجھنا لازمی ہے یعنی مأخذ کی زبان اور ہدف کی زبان سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ نیز دونوں زبانوں کی خصوصیات اور ان کی نحوی تراکیب اور ڈھانچے کو سمجھنا بھی مترجم کے لیے از حد ضروری ہے۔ بدقسمتی سے مستشرقین ان خصوصیات سے متصف نہیں تھے جس کی وجہ سے ان کے تراجمِ قرآن تعصب سے بھرے ہوئے ہیں۔ (۴۴)

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

۱۹۸۲ء میں دارالمصنّفین کے زیر اہتمام اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر ایک نہایت اہم بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا۔ تاریخی اہمیت اور اپنے موضوع پر ایک منفرد شان کے حامل اس سمینار میں اردو، عربی اور انگریزی میں مقالات پیش کیے گئے۔ جو بعد میں مقالات یکجا کیے گئے۔ ان کے ساتھ مستشرقین کے تعلق سے علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی اور دیگر اصحاب علم وفضل کی تحریریں بھی جمع کی گئیں۔ ان سب کو اسلام اور مستشرقین کے نام سے سات جلدوں میں شایع کر دیا گیا۔ ان میں پہلی جلد سمینار کی روداد کے لیے خاص ہے۔

ساتوں جلدوں کی قیمت: ۱۵۵۰ روپے ہے۔ الگ الگ جلدوں کی قیمت اس طرح ہے: اول / ۱۰۰، دوم / ۲۵۰، سوم / ۲۵۰، چہارم / ۲۵۰، پنجم / ۱۵۰، ششم / ۳۰۰، ہفتم / ۲۵۰ روپے۔

---

(۴۳) Haussen Abdul Roaf, *Qur'an Translation, Discourse, Texture and Exegesis* (London and New York: Routledge, 2001), 20.

(۴۴) فوزية العشماري، كيف تعامل الغرب مع القرآن الكريم، مجلة العربي، العدد: ۵۷۸، جنوری: ۲۰۰۷، ص ۲۵-۲۶.

احادیث نبویہ کا کمپیوٹرائزیشن: محمد مصطفیٰ الاعظمی کی خدمات

ڈاکٹر شکیل الرحمن
مئوناتھ بھنجن، مئو

Shakeelmau7@gmail.com

محمد مصطفیٰ الاعظمی ایک ہندوستانی نژاد سعودی پروفیسر تھے۔ ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت صوبہ اترپردیش کے شہر مئوناتھ بھنجن میں ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد انھوں نے جامعہ ازہر (قاہرہ) سے ایم-اے-کیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے کالج Gonville and Caius College سے "اسٹڈیز اِن اَرلی حدیث لٹریچر وِتھ اے کریٹکل ایڈیشن آف سَم اَرلی ٹیکسٹس" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد کلیۃ الشریعۃ و الدراسات الإسلامیۃ، مکہ میں پانچ سال تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر ۱۹۷۳ء میں جامعہ ملک سعود، ریاض، کے شعبہ "قسم الدراسات الإسلامیۃ" میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ یہاں پر تقریباً بیس سال تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۹۱ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ تدریسی خدمات سے قبل انھوں نے نو سال تک قطر کی پبلک لائبریری میں بحیثیت لائبریرین نوکری کی۔ اس دوران انھیں جوزف شاخت کی کتاب "دی اوریجن آف محمڈن جورسپرُڈینس" کے مطالعے کا اتفاق ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے ڈاکٹریٹ کا پختہ ارادہ کیا اور اپنے مقالہ میں احادیث نبویہ سے متعلق شاخت کے الزامات کو عقلی و نقلی دلائل کے ذریعہ مسترد کیا۔

ملازمت کے ساتھ انھوں نے کتاب و سنت سے متعلق کئی عظیم کارنامے انجام دئے۔ ان میں مختلف مخطوطات حدیث کی تعلیق و تحقیق کے ساتھ "صحیح ابن خزیمۃ" کی اشاعت اور ذخیرۂ احادیث کو کمپیوٹرائز کرنا شامل ہے۔ ان کی ان علمی خدمات کے اعتراف میں سعودی عرب نے انھیں ۱۹۸۰ء میں شاہ فیصل عالمی ایوارڈ سے نوازا۔ پھر اس کے دو سال بعد سعودی شہریت دے دی۔ اس کے بعد انھوں نے ریاض کے پاس درعیہ کے علاقے میں سکونت اختیار کی اور وہیں پر ۲۰۱۷ء میں

سپرد خاک ہوئے۔

ان کی قلمی نگارشات کی تعداد ایک درجن سے زائد ہے۔اس مقالے میں ان کے ذخیرہ احادیث کو کمپیوٹرائز کرنے کے بارے میں گفتگو کرنے کی کوشش ہے۔

احادیث کو کمپیوٹرائز کرنے کا خیال: مصطفیٰ الاعظمی کا کہنا ہے کہ پی ایچ-ڈی کی غرض سے برطانیاجانے سے قبل میں کمپیوٹر کی دنیا سے بالکل نا آشنا تھا۔ اپنی پی ایچ-ڈی کے دوران یعنی ۱۹۶۴ء تا۱۹۶۶ء میں نے پہلی مرتبہ کمپیوٹر کو قریب سے دیکھا۔اس وقت کمپیوٹر کی مدد سے مختلف کاموں کے ساتھ یہودیت وعیسائیت کی دینی کتابوں کا مطالعہ بھی ہو رہا تھا۔ لیکن اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ اسی انداز سے کتاب و سنت کا بھی مطالعہ کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس وقت ابھی اس کام کی شروعات ہوئی تھی اور کمپیوٹر عربی زبان سے بالکل نابلد تھا[1]۔

کمپیوٹر سے شناسائی کے تقریباً ایک دہائی بعد امام بخاریؒ کی ۱۲۰۰ ویں میلاد کے موقع پر ۱۹۷۵ء میں امریکہ کے شہر شکاگو میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر الاعظمی نے ایک مقالہ پیش کیا۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر ولیم اے- گراہم (Dr. William A. Graham) نامی ایک مستشرق نے کمپیوٹر کی مدد سے احادیث نبویہ کے مطالعہ کی رائے دی۔ مصطفیٰ الاعظمی کہتے ہیں کہ "اس کے اس بیان اور رائے سے مجھے اس کی بد نیتی کا احساس ہوا کیوں کہ اس کا مقصد احادیث نبویہ کی حفاظت کرنا نہیں تھا بلکہ اس سے اس کی مراد احادیث نبویہ کو مخلوط اور مشکوک بنانا تھا۔ اس لیے میں نے برجستہ انھیں جواب دیتے ہوئے کہا کہ سنت نبویہ پوری طرح سے ہر ایک چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے بشرطِ کہ اس تحقیق میں غیر جانبداری کا ثبوت دیتے ہوئے انصاف سے کام لیا جائے"۔[2]

ڈاکٹر ولیم کی اس بات کو مصطفی الاعظمی نے بڑی سنجیدگی سے لیا اور اس کی تکمیل کے لیے دن

---

[1] الاعظمی، محمد مصطفیٰ، "مشروع خدمة السنة مرکز أبحاث الحدیث"، استخدام الحاسوب فی العلوم الشرعیة، المعهد الإسلامی للبحوث و التدریب، البنک الإسلامی للتنمیة، جدة، ۱۹۹۲ء، ص ۲۵۸؛ سنن ابن ماجہ ، تحقیق محمد مصطفیٰ الاعظمی، شرکة الطباعة العربیة السعودیة، الطبعة الثانیة، ۱۴۰۴ھ / ۱۹۸۴ء، ص:۶

[2] مشروع خدمة السنة، ص:۲۵۸، مقدمہ سنن ابن ماجہ، محققہ محمد مصطفیٰ الاعظمی ص:۶

رات فکر مند رہنے لگے کہ یہ کام کیسے انجام دیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کوئی بھی کسی بھی چیز کا دعویٰ کرکے اسے کمپیوٹر کا کمال بتا دیتا تھا اور لوگ بڑی آسانی سے اسے مان بھی لیتے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں اس بات کی فکر رہتی تھی کہ اگر کسی جماعت نے احادیث نبویہ کے متنی لوازمات کو سمجھے بغیر ان کے مطالعہ کے لیے کمپیوٹر کا استعمال شروع کر دیا تو مسلمانوں میں پھیلائی گئی اسلام دشمنوں کی افواہوں کا تدارک مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے مسلمانوں کو اگر یہ مقابلہ جیتنا ہے تو انھیں اس طرح کے جدید علوم میں کمال پیدا کرکے اس کی کمان اپنے ہاتھوں میں لینی ہوگی[۳]۔ ایسا کرنے سے وہ کتاب و سنت میں کی گئی مستشرقین یا غیر مسلموں کی تحقیقات کو من و عن تسلیم کرنے پر مجبور نہیں ہوں گے[۴]۔

کمپیوٹر سیکھنے اور خریدنے کی کوشش: ڈاکٹر ولیم کی رائے زنی اور حاضرین کی توجہ کے بعد وہ اس کے بارے میں کافی پریشان رہنے لگے تھے۔ اسی پریشانی و فکر مندی میں دو سال کا عرصہ گذر گیا لیکن کوئی خاص تدبیر نظر نہیں آئی۔ ۱۹۷۷ء/۱۳۹۷ھ کی گرمی کی چھٹی میں "ایم-ایس-اے" کی دعوت پر سعودی حکومت کے دارالإفتاء والشؤون الدينية کے صدر شیخ محمد بن ابراہیم بن راشد بن قعود نے اساتذہ کی چار یا پانچ رکنی جماعت کو امریکہ کے ایک علاقہ انڈیانا پولس میں وارث الدین محمد[۵] کے متبعین کو اصل اسلام کی دعوت دینے کے لیے بھیجا۔ اس وفد میں مصطفیٰ الاعظمی بھی شامل تھے[۶]۔

ایم-ایس-اے نے انڈیانا پولس میں "کلچرل سوسائٹی" کے نام سے ایک ریسرچ سینٹر بنایا

---

(۳)

Azami, Aqil M, "Sheikh Al-Azami's Pioneering Work on Qur'an and Hadith-Bringingthem into the Digital Era", International Symposium on M. Mustafa el-Azami: His Life, Ideas and Contributions, Istanbul, Turkey, 19-20 December, 2018, Published 2019, page 61.

(۴) مشروع خدمۃ السنۃ، ص:۲۵۸

(۵) یہ امریکی تنظیم "اسلامی امت" (دی نیشن آف اسلام) کے متحرک رہنما ایلجا محمد کے بیٹے تھے۔ اس تنظیم میں بہت سی غیر اسلامی چیزیں شامل تھیں جس کی انھوں نے اصلاح کی کوشش کی لیکن مخالفت کے سبب انھوں نے اسے چھوڑ کر دی مسلم امریکن سوسائٹی کے نام سے ایک دوسری تنظیم بنائی۔ ۲۰۰۸ء میں شیکاگو میں ان کا انتقال ہوا۔

(۶) مشروع خدمۃ السنۃ، ص:۲۵۸ — Sheikh Al-Azami's Pioneering Work, 61

تھا۔ جس میں انھوں نے اپنے مختلف مقاصد کے تحت HP mini کمپیوٹر لگایا تھا جس کی نگرانی نعمان سامرائی اور ناظم منکرہ (Nazem Minkara) کے ذمے تھی[۷]۔ اس سوسائٹی کا کمپیوٹر لگانے کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ اس کے ذریعے احادیث نبویہ کا مطالعہ کیا جائے۔ ان میں بڑا جوش وولولہ تھا لیکن وہ لوگ بشری تقاضوں اور ظاہری اسباب سے عاری ہونے کی وجہ سے اس کی تکمیل اور اپنے مقصد میں ناکام رہے[۸]۔ تبلیغی مشن کے دوران ایم-ایس-اے-کے کمپیوٹر کو قریب سے دیکھنے اور اس سے کچھ استفادہ کے بعد مصطفی الاعظمی کا شوق مزید بڑھ گیا کہ اب کسی بھی صورت اس کام کو انجام دینا ہے۔ انڈیانا پولس سے ریاض واپس آنے کے بعد انھوں نے اپنی فیکلٹی کے توسط سے جامعہ ملک سعود کی فیکلٹی آف انجینئرنگ سے درخواست کی کہ احادیث کو کمپیوٹرائز کرنے کی کوشش میں ان کی مدد کی جائے۔ لیکن فیکلٹی نے عربک ٹرمنل کی عدم موجودگی اور اس پر بھاری لاگت کے سبب ان کی مدد کرنے سے منع کر دیا[۹]۔ اس کے بعد انھوں نے تنہا اپنے ذاتی خرچ پر اس کام کا منصوبہ تیار کیا اور مسلسل تین سال گرمی کی پوری چھٹی انھوں نے انڈیانا پولس میں گذاری۔ اس عرصے میں انھوں نے کمپیوٹر کے ماہرین کی مدد سے اس کے بنیادی لوازمات کو سیکھا اور اسے عربی لکھنے کا حامل بنایا۔ اپنے اس منصوبے کے تحت انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ محمد فؤاد عبد الباقی کی المعجم المفهرس لألفاظ القرآن کی مانند احادیث کے الفاظ کی ایک ڈکشنری تیار کی جائے اور اس میں احادیث کی ترقیم ایسے کی جائے کہ منزل تک کم وقت میں آسانی کے ساتھ رسائی ہو سکے[۱۰]۔ ابھی تک جس سے لوگ فائدہ اٹھا رہے تھے وہ ونسنک کی زیر نگرانی تیار شدہ المعجم المفهرس لألفاظ الحديث تھی جو چالیس اسکالرز کی محنت سے چالیس سال میں مکمل ہوئی

---

(۷) Sheikh Al-Azami's Pioneering Work, 61

(۸) مشروع خدمة السنة، ص:۲۵۸

(۹) ماخذ سابق، ص:۲۵۹

(۱۰) ماخذ ساق، ص:۲۵۹

Al-Azami, M. Mustafa, "A note on work in progress on computerization of Hadith," *Journal of Islamic Studies*, 1991, vol. 2, No. 1, Oxford UniversityPress, page 86.

تھی[۱۱]۔اس کے باوجود اس میں تقریباً ۷۵ فیصدی مواد کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کچھ غلطیاں بھی ہیں[۱۲]

چنانچہ پورے منصوبہ کے ساتھ مصطفی الاعظمی نے کام شروع کیا۔ ان کے اس منصوبہ کا بنیادی مقصد کتاب وسنت کی حفاظت اور دفاع کرنا تھا۔

احادیث کے کمپیوٹرائزیشن کا آغاز: اس وقت کمپیوٹر کا عربی زبان میں نہ ہونے کے سبب اس عظیم کام کا پورا ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔اسی وجہ سے کوئی بھی شخص ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھا لیکن حصول منزل کی تڑپ نے راستہ ہموار کیا۔اس وقت لوگ جگاڑ سے چھوٹا موٹا کام عربی میں کرتے تھے، لہٰذا ۱۹۷۸ء / ۱۳۹۸ھ کی گرمی کی چھٹی میں جب وہ دوبارہ انڈیانا پولس گئے تو وہاں ناظم منکرہ اور نعمان سامرائی کی مدد سے کمپیوٹر پر عربی میں کچھ لکھنے کی مشق کی۔اس کے بعد وہیں سے ایک انٹلیجنٹ ٹرمینل Intelligent Terminal HP2645R خریدا لیکن اس میں عربی کے تمام حروف نہیں تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس پر کام کرنا شروع کیا۔ ان کے شوق کو دیکھ کر ان کے ساتھی ڈاکٹر احمد شرف الدین[۱۳] نے ان کی بڑی مدد کی۔انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ آسانی سے تصحیح و نظر ثانی کے لیے پہلے ایک ڈیٹابیس بنالیں، اور اس کے لیے عربی الفاظ، راوی اور جگہوں کے نام وغیرہ کی پہلے نشاندہی کرلیں اس کے بعد اسی کے مطابق کمپیوٹر پر لکھیں۔ لہٰذا ان کے تعاون سے انھوں نے سند، متن، پہلا راوی، آخری راوی اور درمیانی راوی ہر ایک کے لیے الگ الگ مختلف علامتیں (Tags) مقرر کیں۔علامتی نشان کے لیے انھوں نے گنتی، رومن حروف اور اسپیشل حروف کا انتخاب کیا تاکہ ان کا عربی حروف سے اختلاط نہ ہو[۱۴]۔ اس کے بعد انھوں نے پہلے کتابوں پر علامتیں لگائیں۔ اس کا آغاز انھوں نے مسند احمد بن حنبل سے کیا۔

---

(۱۱) *Ibid.* p. 86.

(۱۲) مشروع خدمۃ السنۃ، ص:۲۵۹

(۱۳) یہ ملک سعود یونیورسٹی، ریاض کے شعبہ کمپیوٹر سائنس، فیکلٹی آف انجینئرنگ کے استاد تھے۔

(۱۴) علامتی نشانات کی تفصیل کے لیے دیکھیں عقیل اعظمی، عبد العزیز عمر القبانی اور عامر حسین کا مشترکہ مضمون:
"Computational and natural language processing-based studies of hadith literature: a survey." *Artificial Intelligence Review* 52 (2019): 1369-1414. https://link.springer.com/article/10.1007/s10462-019-09692-w

اس تکنیکی کام میں ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر عقیل اعظمی[۱۵] کی بھی محنت شامل رہی۔ درپیش مسائل کا حل انھیں دونوں باپ بیٹے کے مشورے اور کوشش سے ہوتا تھا۔

کتاب پر نشاندہی کے ساتھ ٹائپنگ کا بھی کام شروع ہوا۔ اس کے لیے انھوں نے ایک فلسطینی شخص کو اجرت پر رکھا۔ وہ ہر روز رات کے وقت ان کے گھر آکر ان کی نگرانی اور اشارے پر ٹائپنگ کا کام انجام دیتے۔ اس وقت ہر ہر حرف کو محفوظ کرنے کا طریقہ نہیں تھا بلکہ ایک بار میں پوری اسکرین محفوظ کی جاتی تھی اور ایک اسکرین پر ۲۵ لائنیں اور ہر لائن میں ۸۰ کیرکٹر ہوتے تھے۔

منصوبے کی توسیع اور نیا کمپیوٹر: ٹرمینل پر کامیاب تجربہ کے بعد انھوں نے احادیث کے معجم کے منصوبہ کو وسعت دی اور امہات کتب حدیث کو کمپیوٹرائز کرنے کا وسیع منصوبہ بنایا۔ لیکن یہ وسیع منصوبہ اس چھوٹے سے ٹرمینل کی قدرت سے باہر تھا۔ اس لیے انھوں نے ۱۵۰ایم-بی ہارڈ ڈسک والا ایک مینی کمپیوٹر HP 1000 خریدنے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت اس کمپیوٹر کی قیمت تقریباً تین لاکھ ریال (۷۴۰۰۰ ڈالر) تھی[۱۶]۔ اتنی بڑی رقم کا جمع کرنا جب ان کے لیے مشکل ہو گیا تو انھوں نے اپنی وہ زمین جو ۱۹۷۴ء میں ریاض میں ۲۸ ہزار ریال میں خریدی تھی اس کو دو لاکھ اسی ہزار ریال میں بیچ دیا اور کہا کہ یہ ہے الحسنة بعشر أمثالها یعنی اللہ پاک ایک نیکی کو دس گنا تک بڑھا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد بقیہ رقم کا انتظام کر کے مکمل رقم امریکہ بھیج دی گئی۔ ۱۹۷۹ء کے موسم گرما میں یہ کمپیوٹر انڈیانا پولیس کی کلچرل سوسائٹی میں موصول ہوا۔ اس وقت مصطفیٰ الاعظمی اور ان کا خاندان وہیں پر تھا۔ اس لیے اس کو چیک کرنے کے بعد اسے وہاں سے ریاض کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس نئے کمپیوٹر کو گھر کے سب سے بڑے کمرے میں سیٹ کیا گیا۔ اس کے بعد تیزی سے کام شروع ہوا۔ ۱۹۸۰ء تک حدیث کی پندرہ کتابیں، اسماء الرجال کی تین کتابیں، عربی لغت کی تین کتابیں اور کتاب وسنت سے متعلق چھ کتابیں داخل کمپیوٹر ہو چکی تھیں۔ اب انھوں نے اب تک کے پورے کام کی ایک رپورٹ بنا کر شاہ فیصل عالمی ایوارڈ کمیٹی میں جمع کی۔ جس کے نتیجے میں اسی

---

[۱۵] انھوں نے کمپیوٹر سائنس میں امریکہ سے پی ایچ-ڈی کی ہے اور فی الحال ملک سعود یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ احادیث کے کمپیوٹرائزیشن میں انھوں نے والد کے ساتھ ساتھ کام کیا ہے۔

[۱۶] مشروع خدمة السنة، ص:۲۵۹

سال کمیٹی نے انھیں دراسات اسلامیہ کے میدان میں ایک منفرد کام کے سبب ۲۶/ صفر ۱۴۰۰ھ / ۱۹۸۰ء کو اس ایوارڈ سے نوازا۔

اس کے بعد اگلے سال یعنی ۱۴۰۱ھ / ۱/ ۱۹۸۰ء میں قطر کی راجدھانی دوحہ میں علامہ یوسف القرضاوی کی زیر نگرانی سیرت وسنت کانفرس منعقد ہوئی۔ جس کا اصل مقصد احادیث نبویہ کو درپیش چیلنجز کا حل تلاش کرنا تھا۔ اس میں مختلف ممالک کے ۳۵ متخصص علماء شامل ہوئے تھے، جن میں ایک مصطفیٰ الاعظمی بھی تھے۔ انھوں نے موقع کی مناسبت سے تجویز پیش کی کہ جس طرح کمپیوٹر میں داخل شدہ کتابوں کے نصوص کی صحت کا خیال نہ رکھنے کی صورت میں ایک بڑے خطرے کا اندیشہ ہے، اسی طرح شائع شدہ کتابوں کا ان کے اصل ومعتبر نسخوں سے مقارنہ کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ پھر اس کے بعد ان تمام احادیث کی ایک نئی نمبرنگ کی بھی ضرورت ہے تاکہ احادیث کو تلاش کرنا آسان ہو جائے۔ لیکن اس کام کی مشقت اور طوالت کے سبب کوئی اس کے لیے تیار نہیں ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اکیلے ہی اس کام کو کرنے کا بیڑا اٹھایا[۱۷]۔

منصوبے کی مسلسل توسیع، روز افزوں نئے مسائل کا پیدا ہونا اور سعودی عرب میں پروگرامرز کی عدم موجودگی کے سبب انھوں نے ۱۹۸۱ء میں جامعہ ملک سعود سے ایک سال کی چھٹی لے لی۔ اس کے بعد درپیش مسائل کے حل کی خاطر مشیگن گئے اور بحیثیت وزی ٹنگ اسکالر یونیورسٹی آف مشیگن آن آربر سے جڑے۔ یہاں پر وہ ہر روز صبح ۸ بجے سے آدھی رات تک اپنے حدیث پروجیکٹ میں مصروف رہتے تھے۔ کام کی وسعت ورفتار کے سبب سابقہ کمپیوٹر ایچ-پی-۱۰۰۰ اپنے محدود دائرے کو چھونے لگا تھا۔ جس کے سبب ایک نئے اور وسیع میموری والے کمپیوٹر کی ضرورت پڑی۔ لہٰذا انھوں نے دوسرا مینی کمپیوٹر HP 3000, S44 خریدا۔ اس کے ساتھ انھوں نے ایک ۱۲۰ ایم-بی- کی ہارڈ ڈرائیو، میگنیٹک ٹیپ اور پیچ پرنٹر بھی خریدا۔ اس کے کچھ ماہ بعد ایچ-پی- نے ۴۰۴ ایم-بی- کی صلاحیت والا ایک نیا ہارڈ ڈرائیو جاری کیا تو انھوں نے اسے فوراً خرید لیا۔ اس پورے سسٹم کو رکھنے اور اسے جانچنے کے لیے انھوں نے آن آربر میں ایک دومنزلہ مکان کرایہ پر لیا۔ ان کے بڑے صاحبزادے عقیل اعظمی اس وقت مشیگن یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس میں گریجویشن کر رہے تھے۔ اس لئے اس نئے کمپیوٹر (HP 3000, S44) کی

---

[۱۷] مشروع خدمۃ السنۃ، ص: ۲۶۰

پروگرامنگ کا آغاز انھوں نے ہی کیا۔ لیکن ان کی کلاس کی مصروفیت کے سبب مصطفیٰ الاعظمی نے مختلف پروگرامنگ انجینئروں کو ملازم رکھا جو روزانہ آکر پروگرامنگ کا کام کرتے تھے[۱۸]۔

پروگرامنگ کے بعد داخل شدہ نصوص کی سیٹنگ یعنی ترتیب و تنسیق کا مسئلہ در پیش ہوا تو انھوں نے ایک ڈیجیٹل ٹائپ سٹنگ مشین کی تلاش شروع کی۔ لہٰذا اے-ایم ویری ٹائپر AM Varityper کمپنی کے تحریری اقرار نامہ کے ساتھ خریدا گیا کہ اگر یہ کمپیوٹر کے ساتھ کام نہیں کرے گا تو اسے واپس کر دیا جائے گا۔ گھر لانے کے بعد انجینئر اس کو HP 3000, S44 سے جوڑنے میں ناکام ہو گیا۔ اس کمپنی نے اپنا انجینئر بھیجا جو کئی ہفتہ محنت کے بعد کمپیوٹر سے ٹائپ سٹنگ مشین کا ربط پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب مصطفی الاعظمی کی چھٹی ختم ہو چکی تھی اس لیے انھوں نے اپنی چھٹی میں چھ ماہ کی توسیع کروائی[۱۹]۔ پروگرامنگ اور اس سے متعلقہ امور کی تکمیل میں پورا اٹھارہ مہینہ لگا۔ اس کے بعد یہ پورا سسٹم ریاض پہنچا۔ لیکن اس کی ضخامت اور بڑے حجم کے سبب جامعہ ہاسٹل کی عمارت اس کے بوجھ کو اٹھانے کے لائق نہیں تھی۔ اس لیے انھوں نے جامعہ کے ریکٹر سے زمینی منزل کے اپارٹمنٹ کے لئے درخواست کی جہاں پورا سسٹم لگایا گیا۔ اس کے بعد اس کمرہ سے ان کے لگاؤ کو دیکھ کر ان کے ساتھی بطور مذاق یہ کہنے لگے کہ یہ ان کی دوسری بیوی ہے۔ اس نئے کمپیوٹر کے ذریعے سب سے پہلے المعجم المفهرس لألفاظ سنن ابن ماجة ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء میں تیار کی گئی۔ یہ پورا کام ان کے صاحبزادے عقیل اعظمی نے انجام دیا[۲۰]۔ یہ عرب دنیا کی سب سے پہلی کمپیوٹرائزڈ ڈکشنری تھی[۲۱]۔

اس کے بعد ان کا اگلا منصوبہ یہ بنا کہ کمپیوٹر میں داخل شدہ کتابوں کو مع تخریج شائع کیا جائے۔ لیکن یہ آسان کام نہیں تھا کیوں کہ تخریج کے لیے ایک حدیث کے تمام متون کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے اور حدیث کا ایک لفظ مختلف صیغوں کے ساتھ بھی آتا ہے۔ کمپیوٹر ان تمام کو ایک ساتھ تلاش کرنے میں ناکام تھا۔ لہٰذا اس کے حل کی پہلی کوشش یہ کی گئی کہ کمپیوٹر کو

---

[۱۸] *Sheikh Al-Azami's Pioneering Work*, p. 67

[۱۹] *Sheikh Al-Azami's Pioneering Work, pp. 67-8*

[۲۰] *Sheikh Al-Azami's Pioneering Work*, p. 68

[۲۱] مشروع خدمۃ السنۃ، ص:۲۶۵

نحو وصرف کے قواعد سکھائے جائیں تاکہ اختلاف صیغ کے باوجود اس کے تمام مشتقات ایک جیسے ہو جائیں۔ اس کے لیے اعراب کا مسئلہ آگیا اور یہ ایسا مسئلہ تھا جس سے متون اور کمپیوٹر دونوں نابلد تھے۔ اسی غور وخوض میں سنن ابن ماجہ میں مستعمل اسانید کی ایک معجم تیار ہوگئی۔ اس میں یہ وضاحت کر دی گئی کہ کن کن کتابوں میں کہاں کہاں یہ موجود ہے[۲۲]۔

اعراب سازی: ابھی تک کمپیوٹرائزیشن کا جتنا کام ہوا تھا وہ سب بنا اعراب کے ہوا تھا۔ کیوں کہ کمپیوٹر میں اعراب کی صلاحیت نہیں تھی۔ نیز اس وقت تک کمپیوٹر عربی کے سارے حروف کو ضبط نہ کر سکا تھا اس لیے اعراب کی صلاحیت رکھنا مزید مشکل تھا۔ لیکن تخریج کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ غور وفکر اور تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ کچھ کمپنیوں نے پرسنل مینی کمپیوٹر بنایا ہے جس میں اعراب کی صلاحیت ہے۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی لیکن اس سے ان کا مستفید ہونا مشکلوں سے خالی نہ تھا[۲۳] کیوں کہ اس وقت تک مختلف علوم کی کئی کتابیں بالخصوص حدیث کی سات مشہور کتابیں داخل کمپیوٹر ہو چکی تھیں اور ان پر اچھی خاصی رقم بھی خرچ ہو چکی تھی۔ اس لیے انھوں نے سوچا کہ دوسری کمپنی کی مشین استعمال کرنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ اگر اس نئی مشین کی مدد لی بھی جائے تو داخل شدہ متون کی تعریب میں ایک لمبا عرصہ لگے گا۔ اسی طرح نصوص کی تحقیق ومقارنہ کے لیے ان کا ایک طرز پر لکھا جانا ضروری ہے۔ لیکن کتب احادیث کی طرز تحریر میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کتابیں پوری طرح معرب ہیں تو بعض جزئی اور کچھ کتابیں بنا اعراب کے لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں کچھ مصری ماہرین سے ان کی بات ہوئی اور انھوں نے یقین دلایا کہ ہم اعراب سازی کا کام کر دیں گے۔ اس کے لیے انھوں نے مصر کا سفر کیا اور ان لوگوں سے معاہدہ کیا کہ معجم طبرانی اور مسند احمد بن حنبل کو مکمل معرب کیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے ایک بڑی رقم بھی خرچ کی لیکن سال بھر کے انتظار کے بعد بھی نتیجہ صفر رہا[۲۴]۔

لہٰذا اعراب لگانے کے لیے اب ان کے پاس تین آپشن تھے: پہلا یہ کہ پورے متن کو دوبارہ

---

[۲۲] ماخذ سابق، ص:۲۶۵-۲۶۶

[۲۳] ماخذ سابق، ص:۲۶۶

[۲۴] ماخذ سابق، ص:۲۶۷

اعراب کے ساتھ لکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ لکھے ہوئے متون پر اعراب لگایا جائے۔ تیسرا یہ کہ کسی سافٹ ویئر کے ذریعے اس کام کو انجام دیا جائے۔ اس میں سے کسی ایک کے انتخاب کے لیے انھوں نے پہلے ٹائپسٹ کا امتحان لیا کہ وہ پورے اعراب کے ساتھ ایک کتاب لکھے۔ اس کی تکمیل پر یہ اندازہ ہوا کہ اس میں ٹائپسٹ کی رفتار میں کمی کے ساتھ غلطیاں زیادہ ہوتی ہیں اور دوسرے آپشن میں پریشانی کے ساتھ وقت طلب ہے[۲۵]۔ اس لیے ان دونوں کو ترک کر کے انھوں نے اپنے بڑے صاحبزادے عقیل اعظمی کو یہ ذمہ داری دی کہ وہ کوئی ایسا سافٹ ویئر بنائے جس کی مدد سے یہ کام آسانی سے کیا جاسکے۔ چنانچہ ایک سال کے غور وخوض کے بعد انھوں نے ایک طریقہ ایجاد کیا، جو ۸۰ فیصد صحیح نتیجہ دیتا تھا۔ لہٰذا اسی کی مدد سے تمام مخزونہ کتب پر اعراب لگانے کا کام کیا گیا[۲۶]۔

اس کامیابی کے بعد تخریج کے کام کو آسان بنانے کے لیے انھوں نے عربی لغت کے صیغوں کی ایک معجم تیار کی۔ اس کے لیے انھوں نے کمپیوٹر میں نحو وصرف کے مکمل قواعد کی ان کوڈنگ کی۔ اس کے بعد "مختار الصحاح" کے تمام افعال کو لکھا اور جو افعال ومشتقات مختار الصحاح میں نہیں تھے ان کا الگ سے ایک خاکہ بنایا[۲۷]۔

متون کو سی-ڈی-میں محفوظ کرنا: کمپیوٹر میں داخل شدہ متون میں سے صرف حدیث کے الفاظ کا حجم اسی (۸۰) جلد کے برابر ہو گیا تھا۔ اس میں اگر فہارس کو شامل کرلیں تو ۱۵۰ جلدیں ہوگئی تھیں۔ اس لیے اب ضرورت محسوس ہوئی کہ اسے کسی ایسی جگہ پر محفوظ کیا جائے جہاں پر محفوظ ہو جائے۔ اس کا حل سی-ڈی-روم تھا۔ اس لیے فروری ۱۹۸۷ء میں انھوں نے سی-ڈی-روم کی ایک کمپنی سے معاہدہ کے لیے امریکہ کا سفر کیا۔ لیکن چند ماہ بعد اس کمپنی نے عربی سی-ڈی-بنانے سے منع کر دیا[۲۸] کیوں کہ اسے اندازہ ہوا کہ اس پر تقریباً پچاس ہزار ڈالر کا خرچ ہے اور اس کے

---

(۲۵) Sheikh Al-Azami's Pioneering Work, pp. 69-70

(۲۶) مشروع خدمۃ السنۃ، ص:۲۶۷

(۲۷) ماخذ سابق، ص:۲۶۸

(۲۸) A note on work in progress on computerization of Hadith, p. 89

بعد بھی کامیابی کی کوئی امید نہیں ہے[۲۹]۔

کمپنی سے یہ معاہدہ ٹوٹنے کے بعد انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب اپنا کوئی سافٹ ویئر خود بنانا ہے[۳۰]۔ چنانچہ آئندہ سال یعنی ۱۹۸۸ء میں انھوں نے ایک سال کی دوسری راحتی چھٹی لی اور مقصد کے حصول کے لیے یونیورسٹی آف کولوراڈو، امریکہ کا رخ کیا۔اس وقت ان کے صاحبزادے عقیل اعظمی اسی یونیورسٹی میں .Ph.D کر رہے تھے[۳۱]۔انھوں نے اپنی تحقیق کو ملتوی کیا اور اس میدان کے ماہرین کے ساتھ مل کر اس کام کی تکمیل میں مصروف ہوئے۔ اس نئے پروجیکٹ کے لیے ان کا پلان تھا کہ اس میں منتخب کتب احادیث کا دنیا کی مختلف زبانوں بالخصوص انگریزی اور انڈونیشیائی زبانوں میں لفظی ترجمہ بھی ہو۔اس کے علاوہ احادیث میں مذکور جگہوں اور غزوات کا نقشہ بھی ہو، جنہیں زوم بھی کیا جاسکتا ہو۔انھوں نے یہ خواب اس وقت دیکھا تھا جب کسی کو اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ عربی کے الفاظ ایڈوانس لیول پر خوبصورت انداز میں دکھیں۔ اس وقت کمپیوٹر عربی کا بٹ میپ (Bitmap) نامی فونٹ بمشکل قبول کرتا تھا۔اس لیے اس کو ملٹی میڈیا اور مختلف زبانوں کا حامل بنانے کے لیے ہر ایک کے لیے الگ الگ سافٹ ویئر کی ضرورت تھی۔ چنانچہ پروگرامرز نے اس پروجیکٹ کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ ملٹی لنگول سافٹ ویئر کی ذمہ داری عقیل اعظمی کو ملی اور بقیہ لوگ گرافیکل یوزر انٹرفیس اور ملٹی میڈیا سافٹ ویئر میں مصروف ہوئے۔چند ماہ کی مسلسل محنت کے بعد اس پروجیکٹ میں کامیابی ملی اور ہر ایک کام کا سافٹ ویئر تیار ہوا۔ عربی عبارت کو خوبصورت بنانے کے لیے انھوں نے پروپورشنل ویکٹر فونٹ ایجاد کیا[۳۲]۔

سی-ڈی- کی تکمیل کے بعد جون یا جولائی ۱۹۸۹ء/ ذوالقعدۃ ۱۴۰۹ھ میں اردن کی راجدھانی عمّان کی ایک کانفرنس میں اس کی رسم اجراء ہوئی۔اس کا نام انھوں نے "مکتبۃ الحدیث الالیکترونیۃ" رکھا۔ یہ سی-ڈی- پوری طرح سے عربی میں تھی اور یہ دنیا کی پہلی عربی سی-ڈی-

---

[۲۹] مشروع خدمۃ السنۃ، ص:۲۶۸

[۳۰] A note on work in progress on computerization of Hadith, p. 89

[۳۱] *Sheikh Al-Azami's pioneering work*, p. 71

[۳۲] Ibid, p. 71-2

تھی[۳۳]۔اس کے بعد مختلف تنظیموں اور کمپنیوں نے بھاری اجرت پر ان کو اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی۔ لیکن انہوں نے ہر ایک کی دعوت کو رد کرتے ہوئے کہا کہ "میں بنا کسی باہری دباؤ کے آزاد رہ کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ کسی کی ماتحتی میں کام کرنے کا مطلب ہے کہ اس پروجیکٹ کو کسی ڈائریکٹر یا فنڈنگ کمپنی کے ذمہ داران کے حوالے کرنا ہے۔ یہ لوگ قلم کی ایک حرکت سے پورے پروجیکٹ کو تباہ کر سکتے ہیں"[۳۴]۔

فروری ۱۹۹۰ء بمطابق رجب ۱۴۱۰ھ میں اس کام کا دوسرا ورژن جاری ہوا۔ اس میں کتب سبعہ کے متون کے علاوہ صحیح البخاری کی منتخب احادیث کا بنگالی، جرمن، فرانسیسی، دیوناگری، اردو، انگریزی، ملے، پشتو، اسپانی اور ترکی زبان میں ترجمہ بھی تھا۔[۳۵]

تراجم حدیث: کتب احادیث کو کمپیوٹر پر لکھنے، ان کی معجم اور فہرست تیار کرنے، ان پر اعراب لگانے اور طریقۂ تخریج میں کامیابی کے بعد انھوں نے اپنا اگلا منصوبہ یہ بنایا کہ منتخب کتب حدیث اور احادیث کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ کیوں کہ ان کا ماننا تھا کہ کتاب وسنت پوری دنیا کے انسانوں کے لیے رہنما ہیں، اس لیے دنیا کی مختلف مشہور زبانوں میں ان کا ترجمہ ہونا چاہیے تاکہ عوام آسانی سے اس کو سمجھ سکے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی منصوبہ بنایا کہ کتب احادیث میں جہاں کہیں بھی کسی غزوہ یا تاریخی مقام کا ذکر ہوا ہے وہاں پر کچھ ایسا کیا جائے کہ قاری جب اس لفظ پر کلک کرے تو اس کا نقشہ اور اس کی مختصر تاریخ اسکرین پر کھل جائے۔ اس سے واقعے کی صورتحال کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ چنانچہ انھوں نے اس کے لیے کمپیوٹر کے ماہر انجینئرز کو لگایا اور ان کے درمیان مذکورہ کام کو تقسیم کر دیا۔

اس منصوبے کی تکمیل کے لیے سب سے مشکل کام یہ تھا کہ کمپیوٹر کے اندر یہ صلاحیت رکھی جائے کہ وہ بیک وقت باری باری مختلف زبانوں کو پیش کر سکے۔ غور وخوض کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ اس پریشانی کا حل کوڈنگ اور فونٹ کی ایجاد پر منحصر ہے۔ لہٰذا مختلف انجینئروں کو الگ الگ زبانوں کی کوڈنگ اور فونٹ کے ایجاد کی ذمہ داری دی گئی۔ اردو، فارسی اور ہندی زبان کی ذمہ داری ان

---

(۳۳) Ibid, p. 71

(۳۴) Sheikh Al-Azami's pioneering work, p. 72

(۳۵) A note on work in progress on computerization of Hadith, p. 89

کے صاحبزادے عقیل اعظمی پر عائد ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے کچھ ماہ کی محنت کے بعد اردو اور فارسی کے لیے ۱۹۹۱ء میں "اردو نستعلیق" نامی فونٹ ایجاد کیا۔ دیوناگری اور بنگالی وغیرہ زبانوں کے لیے انھوں نے اس زبان کی ابتدائی کتابوں کی مدد سے جس میں حروف تہجی سکھایا جاتا ہے، ہر ایک کا فونٹ تیار کیا۔ لیکن ابھی بھی ایک پریشانی باقی تھی۔ وہ یہ کہ کچھ زبانوں کے حروف تہجی اتنے زیادہ تھے کہ (SHIFT+) بھی ان کے لیے ناکافی تھی۔ اس مشکل کا حل انھوں نے (CTRL+SHIFT+) کا فارمولہ ایجاد کر کے کیا۔ اس کے بعد جو مشکل پیش آئی وہ یہ تھی کہ ساری زبانیں ایک ساتھ اسکرین پر ظاہر ہوتی تھیں۔ اس کے لیے انھوں نے ڈسپلے انجن کو تبدیل کر کے اس لائق بنایا کہ وہ ہر ایک زبان کو باری باری سے اسکرین پر دکھائے[۳۶]۔ اس طرح ایک سال کی محنت سے تراجم کے کام کو آسان و ممکن بنایا گیا۔

تراجم احادیث کا آغاز جولائی ۱۹۹۰ء سے ہوا۔ اس کے لئے انھوں نے سب سے پہلے ریاض الصالحین کی ایک ہزار احادیث کا انتخاب کیا۔ پھر واشنگٹن ڈی سی میں موجود اپنے ایک آذری دوست سے اس کا آذربائیجانی زبان میں ترجمہ کرایا۔ اس کے بعد صحیح البخاری وغیرہ دوسری کتب احادیث کی منتخب احادیث کا ترجمہ ہوا۔

مخطوطات سے متون کا مقارنہ: سطور بالا میں اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ مصطفیٰ الاعظمی نے قطر میں منعقدہ سیرت و سنت کانفرنس کے موقع پر یہ تجویز پیش کی تھی کہ تمام شائع شدہ کتب احادیث کا ان کے اصل اور قابل اعتماد مخطوطات سے مقارنہ کیا جائے تاکہ انھیں غلطی سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اس کا ایک مکمل خاکہ تیار کیا کہ کیسے کیسے کیا کیا کرنا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے تین باتوں کا خاص خیال رکھا۔ پہلی یہ کہ حتیٰ المقدور مکمل مخطوطہ تلاش کیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ وہ مخطوطہ محرف یا من گھڑت نہ ہو۔ تیسری بات یہ کہ اس پر معروف محدثین کے قرأت وسماع کی توثیق ہو[۳۷]۔

اس کے بعد انھوں نے مجوزہ منصوبے کے مطابق مخطوطات کی تلاش شروع کی۔ تلاش بسیار، سخت محنت اور لمبے خرچ کے بعد وہ سنن نسائی کے سوا کتب ستہ اور مسند امام احمد بن حنبل کے

---

(۳۶) Sheikh Al-Azami's Pioneering Work, p. 73

(۳۷) مشروع خدمۃ السنۃ، ص: ۲۶۰

مختلف مخطوطات کی فلم تیار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کی تفصیلات کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

میں نے مختلف روایات سے مسند احمد بن حنبل کے بیس نسخے جمع کیے۔ یہ سب چوتھی صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری کے درمیان کے تھے اور ان میں سے اکثر پر کبار محدثین کی سماعت کا ذکر ہے۔.....اسی طرح صحیح البخاری کا مجھے وہ نسخہ ملا جو امام یونینی [م: نحو ۷۰۱ھ] کے اصل مخطوطہ سے ان کی وفات کے پچیس سال بعد لکھا گیا تھا۔ نیز اس کے ہر صفحہ پر کبار محدثین میں سے علامہ حافظ عراقی، حافظ الہیثمی، حافظ ابو زرعہ، ابن سید الناس اور ابی حیان النحوی وغیرہ کی دستخط ہیں۔ صحیح مسلم کے بارے میں میں نے علامہ الفراوی [م: ۵۳۰ھ] سے مروی نسخہ پر اعتماد کیا۔ اس کے علاوہ دو نسخے ہیں لیکن دونوں ناقص ہیں۔ ان میں سے ایک ۴۸۸ھ میں نقل کیا گیا ہے اور دوسرا ۵۸۰ھ میں لکھا گیا ہے۔ سنن نسائی کے بیچ کا کچھ حصہ مجھے ملا ہے جو تقریباً ایک ثلث کے برابر ہوگا۔ اس پر کئی اہم سماعتوں کا ذکر ہے۔ البتہ ابو داؤد کے متعدد نسخے میرے پاس ہیں۔ جن میں سے کچھ چوتھی صدی ہجری کے ہیں لیکن وہ بھی ناقص ہیں۔ بعض پانچویں صدی ہجری کے آخر میں لکھے گئے ہیں لیکن اس میں تلفیق کا عمل دخل ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مکمل نسخے بھی ہیں، جن میں سے ایک حافظ ابن حجر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن میں نے اس نسخہ پر بھروسہ کیا ہے جو امام لؤلؤی [م: ۳۳۳ھ] سے مروی ہے اور حافظ المنذری کے اصل مخطوطہ سے نقل کیا گیا ہے۔ سنن ترمذی کے اس نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے جو علامہ الکروخی [م: ۵۴۸ھ] کو پڑھ کر سنایا گیا۔ اس کا ایک ناقص نسخہ بھی میرے پاس ہے وہ بھی علامہ الکروخی کو پڑھ کر سنایا گیا۔ اسکے علاوہ اس کا ایک تیسرا نسخہ جو علامہ المنذری کو پڑھ کر سنایا گیا، وہ بھی میرے پاس ہے۔ اسی طرح سنن ابن ماجہ کا عدیم المثال مخطوطہ ہے جو حافظ ابن قدامہ المقدسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مختلف لوگوں کے سماع کا تذکرہ ہے[۳۸]۔

اس پروجیکٹ کے تحت انھوں نے مختلف ممالک کی اہم لائبریریوں کا دورہ کیا اور شب و روز کی عرق ریزی کے بعد مختلف مخطوطات سے مطبوعہ کتب احادیث کا مقارنہ کرکے ان کی تصحیح کی۔ اسی پروجیکٹ کے ذریعے مطبوعہ کتب احادیث کے متون اور کاتبوں کی غلطیوں کی اصلاح ہوئی۔ نیز اس بات کا بھی علم ہوا کہ پچھلے سو سال سے مسند احمد بن حنبل کے جو نسخے شائع ہو رہے

---

[۳۸] مشروع خدمۃ السنۃ، ص: ۲-۲۶۱

تھے ان میں سے اصل نسخے کے مطابق پورا ایک حصہ ہی غائب تھا۔ اس غائب شدہ حصہ کی تکمیل اسی تقابل کے سبب ممکن ہو پائی ہے[۳۹]۔

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی محنت اور عرق ریزی کا نتیجہ جب اپنی مکمل صورت میں بازار میں آیا تب تک اس کی نقل سستی قیمت میں عوام وخواص میں معروف ہو چکی تھی۔ اس لیے ان کی یہ قیمتی اور مفید لائبریری، جس پر سالوں کی محنت اور لاکھوں کی رقم خرچ ہوئی تھی، لوگوں کے درمیان مقبول نہ ہو سکی۔ ان کی محنت اور اخلاص سے عوام وخواص کی اس عدم توجہی کی شکایت انھیں اپنی زندگی کے آخری ایام تک تھی۔ وہ کہتے تھے کہ لوگوں کو اصل و نقل سے کوئی مطلب نہیں بس سستی ہونی چاہیئے۔ انھیں عیش و عشرت پر لاکھوں کا خرچ برداشت ہے لیکن علم سیکھنے اور کتاب وسنت کے لیے سو روپئے مہنگے پڑتے ہیں۔

خلاصہ بحث: احادیث نبویہ کے کمپیوٹرائزیشن کا خیال سب سے پہلے ڈاکٹر ولیم اے- گراہم نے دیا، جس کو عملی جامہ پہنانے کی پہلی کوشش ایم-ایس-اے- کی کلچرل سوسائٹی نے کی لیکن ان کی ناکامی کے سبب اس کی کامیابی کا سہرا محمد مصطفیٰ الاعظمی کے سر باندھا گیا۔ اس کام کے پیچھے ان کا واحد مقصد احادیث نبویہ کی حفاظت کرنا تھا۔ عہد جدید میں کتاب وسنت کو تکنیکی دنیا سے سب سے پہلے متعارف کرانا ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ اپنے اس عظیم کام کے ذریعے انھوں نے ایک طرف تکنیکی دنیا سے متنفر اور بدظن علماء و دانشوران کو اس بات کا قائل کیا کہ اسلام کی سربلندی اور اس کی حقانیت کو عام کرنے کے لیے تکنیکی دنیا میں قدم رکھنا اور ان میں کمال پیدا کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایمان کی حفاظت کے لیے شرک وبدعت سے دور رہنا۔ دوسری طرف انھوں نے اُن روشن خیال اور جدت پسند لوگوں کو، جو یہ سمجھتے اور پوری دنیا میں شور مچاتے ہیں کہ اسلام ایک تنگ نظر اور شدت پسند دین ہے، یہ پیغام دیا کہ اسلام ان کی روشن خیالی سے کہیں زیادہ روشن خیال ہے۔ اس نے حرام و حلال اور نفع و نقصان کے درمیان تمیز اور ایمانی پختگی و کمزوری کو انسانیت کی ترقی و تنزلی کا معیار بنایا ہے۔ وہ پوری دنیائے انسانیت بالخصوص مسلمانوں کو تکنیکی آلات اور نئی ایجادات کے استعمال سے کبھی منع نہیں کرتا ہے بشرطِ کہ وہ چیز اللہ کی وحدانیت اور اس کی الوہیت میں مانع نہ ہو۔

---

[۳۹] A note on work in progress on computerization of Hadith, p. 87

مولانا ابو الکلام آزاد کی ترجمہ نگاری

ڈاکٹر محمد اکرم السلام اعظمی
شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی
mmakram1971@gmail.com

مولانا ابو الکلام آزاد (۱۱/نومبر ۱۸۸۸–۲۲/فروری ۱۹۵۸ء) ایک جلیل القدر عالم، عظیم المرتبت خطیب، رفیع الشان انشاپرداز، ممتاز مجاہد آزادی، معروف رہنما، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم اور متعدد امتیازی صفات کے جامع تھے۔ انہوں نے عنفوان شباب میں ہی قلم و قرطاس سے اپنا رشتہ استوار کر لیا تھا۔ آغاز کار میں ان کی خامہ فرسائی کا پہلا جلوہ ترجمہ تھا۔ امام جلال الدین سیوطی کا احکام جمعہ کے موضوع پر عربی میں ایک رسالہ 'نور اللمعۃ فی خصائص الجمعۃ'[1] ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا آزاد کی اولین کاوشِ قلم ہے[2]؛ جو شاید طبع نہیں ہو سکا۔ البتہ ترجمے کا یہ کام انھوں نے جن کے لیے انجام دیا تھا؛ ان کی طرف سے بہ طور صلہ " آئین اکبری" کا ایک نسخہ عطا ہوا تھا، جو مولانا کے پاس آخر تک باقی رہا۔ اس پہلی قلمی کوشش کے بعد انھیں ترجمے کے کام میں ایک لذت سی محسوس ہوئی چنانچہ متعدد چھوٹے چھوٹے رسالوں کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا؛ انھی میں امام سیوطی کا ایک اور رسالہ 'أنیس اللبیب فی خصائص الحبیب'[3] ہے۔ یہ ترجمہ 'خصائص محمدیہ' کے نام سے طبع ہوا۔

اسی طرح مولانا آزاد نے انھی ایام میں أبو حامد محمد بن محمد بن محمد بن أحمد الغزالی کی کتاب

---

[1] امام سیوطی کی کتاب کا صحیح نام یہی ہے، تاہم آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی کتاب میں سہواً مذکورہ کتاب کا نام نور اللمعۃ في فضائل الجمعۃ درج ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، مولانا ابو الکلام آزاد بہ روایت: ملیح آبادی، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۵۸ء، ص: ۲۷۰

[2] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، مولانا ابو الکلام آزاد بہ روایت: ملیح آبادی، ص: ۲۷۰

[3] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی میں اس کتاب کا یہی نام درج ہے۔ ملاحظہ ہو ص: ۲۷۰۔ البتہ کتاب مذکور کا صحیح نام غالباً 'أنموذج اللبیب في خصائص الحبیب' ہے۔

'منہاج العابدین' کا مکمل اردو ترجمہ کیا، جو چھپ کر شائع ہوا[۴]۔ اسی دوران میں انھوں نے ملا نورالدین عبد الرحمن جامی کی کتاب 'نفحات الأنس' کے چند اجزاء کا ترجمہ کیا تھا، لیکن کتاب ضخیم ہونے کی وجہ سے یہ ترجمہ ناتمام رہا۔ بعد ازاں سرسید کے 'تہذیب الأخلاق' اور 'النظر' کے زیر اثر امام غزالی کے 'مضنون صغیر و کبیر'[۵] نامی رسالے کا مکمل ترجمہ کیا۔

اسی زمانے میں مولانا آزاد نے امام غزالی کی مشہور کتاب 'تہافت الفلاسفۃ' کا بھی ترجمہ شروع کیا تھا، جو غالباً ناتمام رہا۔ یہ تمام تفصیلات عبد الرزاق ملیح آبادی کی ترتیب دی ہوئی کتاب 'آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی' میں صفحات ۲۶۹- ۲۷۴ میں قدرے وضاحت کے ساتھ درج ہیں۔

خود مولانا آزاد کے بہ قول ان کی یہ قلمی کاوشیں ان کی تصنیفی زندگی کا نقطۂ آغاز تھیں اور غالباً بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ تھا[۶]۔ پھر ان کی توجہ ترجمہ سے مضمون نویسی اور اخبار نویسی کی طرف منعطف ہو گئی۔ سب سے پہلے انھوں نے اخبار 'المصباح' میں لکھا، پھر 'مخزن'، 'أحسن الأخبار'، 'تحفۂ أحمدیہ' اور 'خدنگ نظر' میں خامہ فرسائی کی۔ اسی دوران انھوں نے 'ہیئت جدیدہ' نامی فارسی کتاب کا، جو أصلاً کسی یوروپی مصنف کی کتاب کا فارسی ترجمہ تھا، اردو ترجمہ شروع کیا۔ لیکن سخت اصطلاحوں، خاکوں اور نقشوں کی بہ دولت اسے ادھورا ہی چھوڑنا پڑا۔ شروع کے اس دور میں انھوں نے محمد حسین آزاد کے تذکرۂ آب حیات کے اول حصہ کے دور دوم تک کے متن کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا اور ایک باکمال ایرانی فارسی استاذ مرزا محمد حسین کو دکھا کر اپنے ترجمے پر اصلاح بھی لی[۷]۔

مولانا آزاد کی اپنی تصریح کے مطابق علامہ شبلی سے ان کی پہلی ملاقات بمبئی میں ۱۹۰۴ء میں ہوئی تھی، اور اسی ملاقات میں علامہ نے انھیں الندوۃ کے لیے مضامین لکھنے کو کہا تھا پھر جب علامہ اس ملاقات کے کچھ ہی دنوں بعد حیدرآباد سے مستعفی ہو کر مستقل طور پر ندوۃ العلماء لکھنؤ آ گئے

---

[۴] ملاحظہ ہو: کتاب آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص: ۲۷۱

[۵] 'مضنون' کا اور اس کے مضامین کا سرسید نے تعارف کرایا تھا؛ اور ان پر نہایت عاقلانہ ریویو تحریر کیا تھا؛ مطالعہ کے لیے دیکھیے: 'مقالات سرسید' حصہ سوم، محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۱، ص: ۴۷

[۶] ملاحظہ ہو آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص: ۲۷۲

[۷] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص: ۲۲۶

توانھوں نے ان سے اصرار کیا کہ وہ بھی لکھنؤ آکر الندوۃ میں ان کا ہاتھ بٹائیں چنان چہ مولانا آزاد لکھنؤ آگئے اور علامہ نے الندوۃ کی ایڈیٹری ان کے سپرد کر دی، جسے انھوں نے سات آٹھ مہینے انجام دیا[۸]۔

الندوۃ سے وابستگی کے اسی زمانے میں مولانا آزاد نے اپنے دوسرے مضامین کے ساتھ مصری دانشور محمد فرید وجدی آفندی (۱۸۷۸-۱۹۵۴ء) کی عربی کتاب 'المرأۃ المسلمۃ' کا اردو ترجمہ بھی اس میں شائع کیا۔ چنانچہ اس حوالے سے ڈاکٹر ملک زادہ منظور کہتے ہیں:

> الندوۃ میں مولانا کا موضوع تحریر فرید وجدی مصری کی کتاب "المرأۃ المسلمۃ" بھی تھی، جسے مولانا نے اردو میں اپنالیا تھا۔ اس کتاب میں طبی، شرعی اور ہر قسم کے دلائل سے ثابت کیا گیا تھا کہ عورت مرد کے برابر نہیں ہے، اور علمی، تاریخی، اجتماعی، عمرانی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یہ دکھایا گیا تھا کہ بے پردگی عورتوں کے طبعی فرائض کے خلاف اور فطرت کے مخالف ہے۔ یہ مضامین کتابی صورت میں روز بازار پریس امرتسر سے وکیل سیریز میں شائع ہو چکے ہیں۔[۹]

اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانا آزاد کی تصنیفی زندگی کا آغاز ترجمہ سے ہوا تھا۔ لیکن آج تک کسی صاحبِ قلم نے مولانا آزاد کی ترجمہ نگاری کو خصوصی موضوعِ بحث نہیں بنایا۔ ممکن ہے اس کی وجہ عام طور پر باور کی جانے والی یہ بات ہو کہ ترجمہ ایک فرومایہ کوشش ہے، اور اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ حالانکہ خود مولانا آزاد کی نظر میں ترجمہ کی جو اہمیت ہے، وہ ان کے درج ذیل اقتباس سے واضح ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ یہ محولہ اقتباس اس وقت کے ہندستانی دارالسلطنت کلکتہ سے مولانا کی ادارت میں نکلنے والے ماہ وار رسالے 'لسان الصدق' سے مأخوذ ہے۔ اگست، ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں شائع ایک مضمون بہ عنوان: 'اردو زبان ایک علمی زبان کا درجہ کیوں کر حاصل کر سکتی ہے؟'۔ اس اقتباس میں مولانا آزاد انجمن ترقی اردو کی خدمات کے حوالے سے فن ترجمہ اور ترجمے کے کاموں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> اردو زبان جبھی ترقی کر سکتی ہے اور علمی زبان بن سکتی ہے جب کہ اس میں باضابطہ تراجم علوم وفنون کا سلسلہ قائم کیا جائے۔ جدید علوم کے ہر صیغے میں مبسوط اور جامع کتابیں ترجمہ کی جائیں۔

---

[۸] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص: ۳۱۲و۳۱۴

[۹] ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، مولانا ابوالکلام آزاد: فکر و فن، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۸۸ء، ص: ۹۷

علوم وفنون کا کوئی پہلو یوروپ کی زبانوں میں ایسا نہ ہو جس کا اردو میں ترجمہ موجود نہ ہو۔[۱۰]

اپنے اسی مضمون کے اندر ترجمہ کی بابت غلط فہمی کا باعث بن جانے والی سر سید اور علامہ شبلی کی بعض تحریروں کا حوالہ دے کر مولانا آزاد نے ان کی توجیہ بھی کی ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی کے مضمون "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" کے ضمن میں بتایا ہے کہ اس میں خلفائے عباسیہ کے زمانے میں ہونے والی ترجمہ کی کارگزاریوں پر تبصرہ اور دور جدید سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے علامہ کے نوکِ قلم پر کچھ ایسے منفی جملے آگئے ہیں جن سے ترجمے کی اہمیت پر حرف آتا ہے۔ اس غلط فہمی کے ازالے کے لیے مولانا آزاد نے علامہ شبلی کو ایک خط ارسال کر کے اس کی وضاحت طلب کی اور پھر ان کے جوابِ خط کو اپنے اس مضمون کا حصہ بنایا۔ اپنے اس جواب کے اندر علامہ نے مولانا آزاد کے استفسار کی وضاحت کچھ یوں فرمائی ہے:

'مکرمی! آپ کا دلچسپ والا نامہ پہنچا۔ ترجمہ کا میں مخالف نہیں ہوں۔ 'گزشتہ تعلیم' میں سر سید نے مجھے وہ عبارت جبراً لکھوادی تھی، میں نے سخت انکار کیا تھا، لیکن ان کا اصرار غالب آیا۔ میں تو ترجمہ کو اصلی علمی خدمت سمجھتا ہوں؛ بلکہ اِن شاء اللہ اس کا باضابطہ سر رشتہ قائم کروں گا (شبلی ۲۲ مارچ ۱۹۰۳ء)[۱۱]

ترجمے کی اہمیت وافادیت کے سلسلے میں مولانا آزاد کے ان خیالات کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ترجمے کے مذکورہ بالا جو کام کیے تھے، اس کے پیچھے در اصل ان کی غرض یہ تھی کہ قومی زبان کو ترقی سے ہمکنار کیا جائے، دوسری زبانوں کے علوم ومعارف سے اسے مالا مال کیا جائے اور قومی ثقافت کے احیاء کی خدمت انجام دی جائے۔

ترجمے کے باب میں مولانا آزاد کی ان خدمات کے بارے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ گرچہ انھوں نے کئی عربی کتابوں اور رسالوں کا اردو میں ترجمہ کیا، جن میں دو تین طبع بھی ہوئیں، انھوں نے ایک فارسی کتاب کا بھی اردو میں ترجمہ کیا؛ پھر محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' کے حصہ اول کے دور دوم کو اردو سے فارسی میں منتقل کیا۔ تاہم مولانا آزاد کے حوالے سے کوئی ایسی

---

[۱۰] لسان الصدق، کلکتہ، اگست و ستمبر ۱۹۰۴ء، ص نمبر: ۳ (یک جا عکسی اشاعت بین الدفتین)، مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پاکستان، ص: ۳۰۵-۳۰۶۔

[۱۱] ماخذ سابق، ص ۳۱۱۔

روایت کہیں نہیں ملتی کہ انھوں نے اردو یا کسی اور زبان سے کوئی ترجمہ عربی زبان میں انجام دیا ہو۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اگر یہ کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا کہ خود مولانا کی اپنی تصریحات کے مطابق ان کی مادری زبان عربی تھی حتی کہ گھر کے اندر عام بول چال کی زبان بھی عربی ہی تھی[۱۲]۔ تاہم آج کا طالبِ علم محسوس کرتا ہے کہ عربی زبان میں مولانا کی کوئی مستقل تصنیف ہے نہ ترجمہ۔ اس حوالے سے احمد سعید ملیح آبادی (فرزند عبد الرزاق ملیح آبادی راوی 'آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی') کا درج ذیل اقتباس چشم کشا ہے؛ وہ فرماتے ہیں کہ:

> یاد رہے کہ مولانا آزاد کی مادری زبان عربی تھی، اردو اکتسابی اور پدری زبان تھی؛ مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ عربی میں مولانا لکھتے نہیں تھے، ان کی کوئی تصنیف اور قابلِ ذکر تحریر عربی میں نہیں ملتی۔ مولانا آزاد اردو میں سوچتے اور اردو میں لکھتے۔ پندرہ روزہ عربی مجلہ 'الجامعۃ' کلکتہ سے مولانا ملیح آبادی کی ادارت میں نکلا، جس کا مقصد حجاز کی آزادی کے لیے ابن سعود کی جدوجہد کو تقویت پہنچانا تھا۔ 'الجامعۃ' میں بھی مولانا آزاد کے قلم سے کوئی مضمون نہیں چھپا۔ آزادی کے بعد مولانا کے حکم سے ۱۹۵۰ء میں 'انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز' قائم ہوئی اور عربی رسالہ 'ثقافۃ الہند' مولانا ملیح آبادی کی ادارت میں جاری کیا گیا تو مولانا کی [کوئی] عربی تحریر اس میں بھی شائع نہیں ہوئی۔[۱۳]

جہاں تک ایک عربی کتاب 'المرأۃ المسلمۃ' کے اردو ترجمہ 'مسلمان عورت' کا مسئلہ ہے تو اس میں بھی اصل ترجمے کی کیفی و کمی قدر پیمائی سے پہلے بدیہی حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی مولانا کا کسی اردو کتاب کا عربی میں کیا گیا کوئی ترجمہ نہیں ہے بلکہ اپنی مادری زبان سے ایک اکتسابی زبان میں کیا گیا ترجمہ ہے۔ مولانا آزاد نے قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کا مہتم بالشأن کام بھی انجام دیا، لیکن وہاں بھی یہی حقیقت جلوہ گر ہے۔ گویا احمد سعید ملیح آبادی کا اٹھایا گیا سوال اپنی جگہ دلچسپ ہونے کے ساتھ حیرت انگیز بھی ہے۔

'المرأۃ المسلمۃ' محمد فرید وجدی آفندی (۱۸۷۸-۱۹۵۴ء) کی تصنیف ہے۔ وہ ایک اسلام پسند

---

[۱۲] ملاحظہ ہو: آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص: ۲۲۲-۲۲۳

[۱۳] ابو الکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت، مرتبہ: رشید الدین خاں، مقالہ بہ عنوان 'ابو الکلام آزاد ادیب اور صحافی' از قلم: احمد سعید ملیح آبادی، ص: ۲۹۴- ۲۹۵

مصری ادیب و دانشور تھے۔ انھوں نے ایک لمبی مدت تک مصر کے مشہور و معتبر مجلہ 'الأزہر' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ زبان و ادب، اسلامی علوم و ثقافت اور عصری مسائل پر ان کی متعدد اور گراں قدر تصانیف ہیں۔ ان کی ان تمام ادبی کاوشوں میں دینی آگہی اور اسلامی رنگ بہت نمایاں ہے۔ 'المرأۃ المسلمۃ' پہلی دفعہ ۱۹۰۱ء میں مصر میں طبع ہوئی تھی۔ یہ کتاب دراصل ایک روشن خیال مصری مصنف قاسم أمین کی دو کتابوں: (۱) 'تحریر المرأۃ' اور (۲) 'المرأۃ الجدیدۃ' کی تردید میں لکھی جانے والی چند کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب نے قاسم أمین کے غیر اسلامی خیالات اور گمراہ کن نظریات کا مسکت و مدلل جواب فراہم کیا تھا۔

فرید وجدی کی اس مفید کتاب کو ہندستان کے معاشرے اور سماج کے لیے کار آمد سمجھتے ہوئے، اس وقت کے نوجوان فاضل مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو کا جامہ عطا کیا تھا، جو 'مسلمان عورت' کے نام سے شائع ہوا۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا آزاد کی تصنیفی زندگی کے اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب وہ ماہنامہ 'الندوۃ' کی ادارت سے وابستہ تھے۔ یہاں پر بہ طور شہادت مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک اقتباس پیش ہے:

> ۱۹۰۵ء کا آخری زمانہ تھا جب یہ نام [ابوالکلام آزاد] اول اول نظر سے گزرا۔ 'الندوۃ' مرحوم کے ایک محترم مضمون نگار کی حیثیت سے.... مولانا [آزاد] اس وقت تک 'مولانا' نہ تھے، محض ابوالکلام آزاد تھے۔ ماہ نامہ 'خدنگ نظر' (لکھنؤ) میں ایک آدھ مضمون لکھ چکے تھے اور شاید اپنا ہفتہ وار 'لسان الصدق' (کلکتہ) بھی کچھ دن قبل نکال چکے تھے۔ بہر حال 'الندوۃ' میں موضوع تحریر فرید وجدی مصری کی کتاب 'المرأۃ المسلمۃ' تھی، جسے مولانا نے عربی سے اردو میں اپنالیا تھا۔ اور اسے [اس میں] جدید طبقے کے جواب میں طبی، شرعی ہر قسم کے دلائل سے یہ دکھایا تھا کہ عورت مرد کے برابر نہیں اور دونوں کی مساوات کا تمام تر دعوی غلط ہے'۔ (۱۴)

ہند و پاک دونوں جگہوں پر 'مسلمان عورت' کی دستیاب اشاعتوں کو دیکھا جائے تو ہماری معلومات کی حد تک کل چھ اشاعتیں سامنے آتی ہیں۔ ان میں قدیم ترین کی تعیین دشوار ہے کہ بعض اشاعتوں پر سنۂ طباعت و اشاعت کا اندراج نہیں پایا جاتا ہے۔ جن اشاعتوں میں طباعت

---

(۱۴) آئینۂ ابوالکلام (مجموعۂ مقالات) مرتبہ: عتیق صدیقی، مقالہ بہ عنوان 'مولانا آزاد- چند یادیں' از مولانا عبدالماجد دریابادی، ص: ۴۹

واشاعت کے سال کا ذکر ہے؛ ان میں قدیم ترین اشاعت ۱۹۶۳ء کی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۵ء، ۲۰۰۸ء، ۲۰۱۲ء اور ۲۰۱۶ء کی اشاعتیں ہیں۔ بہ ظاہر یہ کتاب تقسیم ہند سے پہلے بھی لازماً طبع ہوئی ہوگی۔ چنانچہ ۲۰۱۶ء کی اشاعت کے عرضِ ناشر میں لکھا ہوا ہے کہ ”پہلی بار یہ کتاب پاکستان کے قیام سے کئی سال پہلے شائع ہوئی“۔[۱۵] البتہ ممکن ہے کہ اولین اشاعتوں میں سنۂ طباعت واشاعت کے ذکر کا التزام نہ رکھا گیا ہو۔

اس کتاب کا ۲۰۱۶ء میں مکتبہ جمال لاہور سے شائع ہونے والا نسخہ اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس میں خود امام الہند کا مقدمہ اور مولانا محمد حنیف ندوی کا دیباچہ تو ہے ہی۔ البتہ اس اشاعت کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے اندر میاں مختار احمد کھٹانہ کا ایک ڈیڑھ صفحی عرض ناشر ہے اور لاہور کے معروف اسکالر احمد جاوید کا دو صفحوں پر مشتمل ایک پیش لفظ بھی ہے۔

اس کتاب کے بارے میں کچھ لوگوں نے دعوی کیا ہے کہ وہ فرید وجدی کی کتاب پر تبصرہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب (مسلمان عورت) اصل عربی کتاب 'المرأۃ المسلمۃ' کا مباحث اور مضامین کی بنیاد پر ایک انتخابی اور تلخیصی اردو ورژن ہے؛ جن کے درمیان میں جابجا خود مولانا آزاد کے اپنے تخلیقی فقرے اور جملے بلکہ پیرے اور اقتباسات ہیں، جنہیں انھوں نے ایسے مسلسل اور مربوط انداز میں کتاب کا توضیحی حصہ بنا دیا ہے کہ مصری مصنف کے جملوں اور عبارتوں کے اردو قالب اور مولانا کے آزادانہ فقرے اور اقتباسات میں تمیز آسان نہیں ہے۔ چنانچہ عربی کتاب کی کل تیرہ فصلوں میں سے پہلی فصل کا عنوان ہے: ماهي المرأة؟ یعنی عورت کیا ہے؟ اور دوسری فصل کا عنوان ہے: ماهي وظيفة المرأة الطبيعية؟ یعنی عورت کی فطری اور قدرتی ذمہ داری کیا ہے؟ مولانا نے ان دونوں عناوین کو یکجا کر کے اپنی کتاب 'مسلمان عورت' کے پہلے ہی سبق میں 'عورت کیا ہے؟ اور اس کے قدرتی فرائض کیا ہیں؟ کی سرخی لگائی ہے۔ اس طرح انھوں نے دو عربی فصلوں کو ایک اردو فصل بنا دیا ہے۔ اسی طرح واحد لفظ 'وظیفۃ' کا ترجمہ انھوں نے جمع لفظ 'فرائض' سے کیا ہے۔

---

[۱۵] 'مسلمان عورت': مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص: ۷

الفاظ و ترکیب کی قید اور بندشِ ترتیب سے آزاد رہ کر ''مسلمان عورت'' مولانا ابوالکلام آزاد کی آزاد ترجمانی کا یہ ایک اچھا نمونہ ہے؛ جس کے اندر مجملہ مفہوم کی ادائی کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اور مدعا کو اپنے الفاظ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

مولانا آزاد کے ترجمۂ قرآن کا کام مولانا کی پچھتّر عمر کا کارنامہ ہے۔ مولانا کے 'ترجمان القرآن' کی پہلی جلد ۱۹۳۰ میں شائع ہوئی تھی، گویا فرید وجدی مصری کی کتاب 'المرأۃ المسلمۃ' کے اردو ترجمہ 'مسلمان عورت' کے کوئی ربع صدی بعد۔ ظاہر ہے لوح و قلم سے جو رشتہ مولانا نے اپنے آغاز شباب سے استوار کر رکھا تھا؛ اس وقت وہ نہ صرف پختہ نگاری کے مرحلے میں تھا بلکہ 'الہلال' و 'البلاغ' کی سحر طرازی و آتش بیانی سے گزر کر ایک منفرد اسلوب کا حامل ہو چکا تھا۔

جس طرح 'المرأۃ المسلمۃ' کے اردو ترجمہ 'مسلمان عورت' کے حوالے سے اہل علم نے الگ الگ رائے زنی کی ہے، بلکہ متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے، اسی طرح مولانا کے قرآنی ترجمہ کے باب میں بھی وہ مختلف الخیال واقع ہوئے ہیں۔ مولانا کے ایک عظیم معاصر سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳) نے اپنے ایک مضمون میں 'ترجمان القرآن' کو ''قرآن مجید کا مؤثر تفسیری ترجمہ''[۱۶] قرار دیا ہے۔ سید صاحب کے ایک ممتاز شاگرد، عربی ادیب و انشاپرداز مولانا مسعود عالم ندوی (۱۹۱۰-۱۹۵۴) کے حوالے سے مولانا ماہر القادری (۱۹۰۶-۱۹۷۸) نے مولانا آزاد کے ترجمۂ قرآن کی بابت درج ذیل جملے تحریر کیے ہیں:

> مولانا ابوالکلام آزاد کی ذہانت و فطانت کے وہ [مولانا مسعود عالم ندوی] قائل تھے، مگر یہ جوان کی 'عربی دانی' کا چار دانگ عالم میں شہرہ ہے؛ اس کے بارے میں فرمایا کہ اُن کو 'عربی' نہیں آتی! کہتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن کا جو ترجمہ کیا ہے، اس کو پڑھ کر یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد عربی جانتے تھے مگر ابوالکلام آزاد کو عربی نہیں آتی! چنانچہ انھوں نے مولانا آزاد کے ترجمۂ قرآن کی غلطیوں پر نشان بھی لگا لیے تھے اور 'المائدۃ' تک یہ کام ہو چکا تھا۔

---

[۱۶] ہفت روزہ 'ماحول' کراچی، آزاد نمبر، جلد ۶، شمارہ ۱۷-۱۸، ستمبر ۱۹۶۰، مضمون بہ عنوان 'یوسف ثانی' از سید سلیمان ندوی، ص: ۸

میں نے اب کی بار مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم سے شدید اصرار کیا کہ آپ ان اغلاط پر ایک مضمون لکھ کر مجھے دیجیے۔ 'فاران' میں یہ مضمون شائع ہوگا۔ حکیم نصیر میاں نے بھی میری ہمنوائی کی۔ راضی ہوگئے اور غالباً راولپنڈی خط بھی لکھ دیا تھا کہ مولانا آزاد کا ترجمہ کیا ہوا وہ نسخۂ قرآن بھیج دیا جائے جس پر اُن کے نشانات لگے ہوئے ہیں۔ افسوس کہ بہت سے عزائم کی طرح یہ ارادہ بھی ادھورا رہ گیا![۱۷]

مولانا ماہر القادری نے مسعود عالم ندوی کے حوالے سے اپنے اسی مضمون کے حاشیے میں یہ بات لکھی ہے کہ " میں نے عرض کیا کہ مولانا آزاد کے ترجمے کی کوئی غلطی تو بتایئے۔ قرآن کی آیت پڑھ کر بولے، انھوں [مولانا آزاد] نے 'یحکم' کا ترجمہ 'فیصلہ' کے بجائے 'حکم دینا' کیا ہے!"[۱۸]۔

شورش کاشمیری نے مولانا آزاد کے ترجمۂ قرآن کی بہت سی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے ایک اور پہلو کو اہمیت دی ہے:

مولانا سے پہلے قرآن پاک کے تراجم، عربی آیات کے الفاظ کا تحتانی ترجمہ تھے۔ یعنی جس ترتیب سے سورہ کے الفاظ تھے، اسی ترتیب سے الفاظ کے نیچے ان کا ترجمہ تھا۔ ان ترجموں میں الفاظ کے لغوی معنوں کا التزام کیا جاتا لیکن اس طرح نہ تو کلام پاک کا زور پیدا ہوتا اور نہ وہ دلنشینی ابھرتی جو قرآن پاک کی دعوت کا سحر ہے۔ مولانا نے اس روش کو یک قلم موقوف کر دیا۔ وہ اردو زبان کے پہلے مترجم و مفسر ہیں جنھوں نے قرآن کا ترجمہ قرآن ہی کے الفاظ میں اس شکوہ سے کیا کہ داغ کا وہ شعر با معنی ہو گیا:

احمد پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور ورنہ قرآن بھی آتا بہ زبان اردو[۱۹]

بہر حال مولانا آزاد کی ترجمہ نگاری اور ترجمۂ قرآن کے حوالے سے ان مختلف آرا کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ اہلِ علم کے سامنے تمام نقطہ ہائے نظر رکھ دیے جائیں اور اپنا حاصلِ مطالعہ پیش کر دیا جائے تاکہ انھیں مزید غور و فکر اور استنباطِ نتائج میں مدد ملے۔

---

[۱۷] ماہ نامہ 'فاران' اپریل ۱۹۵۴ء، یاد رفتگاں، جلد دوم، از: ماہر القادری، مرتبہ: طالب ہاشمی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، ص: ۳۱۰

[۱۸] ماخذ سابق: ۳۱۰

[۱۹] 'ابوالکلام آزاد (سوانح و افکار)': شورش کاشمیری، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، سنۂ اشاعت غیر مذکور، ص: ۳۰۹

مدارس عربیہ میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

دنیا اللہ پاک کی "سنت" یعنی اٹل قوانین کے مطابق چلتی ہے(ولن تجد لسنة الله تبديلا۔۔ الاحزاب:۶۲)۔ حقیقی تدین، علم سے رغبت، بدلتے ہوئے حالات سے باخبری، اہم مقاصد کے لئے فردی اور اجتماعی قربانی، باہمی اتحاد، خوش معاملگی، خوش اخلاقی: یہ صفات کسی قوم کی ترقی کی بنیادی سیڑھیاں ہیں اور ہماری قوم – یعنی مسلمانان ہند – ان بنیادی سیڑھیوں کے بالکل نچلے پائدان پر کھڑی ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے ہم اس کے مستحق ہیں۔

اس دنیا کے لئے اللہ پاک نے "سنت" (اٹل قوانین) بنائی ہے اور وہ سب پر لاگو ہوتی ہے۔ ہمارے لئے اللہ پاک کا کوئی الگ سے قانون نہیں بنے گا۔ جو لوگ اللہ پاک کے قانون سے روگردانی کرتے ہیں وہ دنیا میں عزت اور ترقی کے استحقاق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس حالت سے نکلنے کے لئے خود ہم کو انفرادی اور اجتماعی کوشش کرنی ہوگی (إن الله لا يغيرما بقوم حتى يغيروا ما بأنفسهم ۔الرعد:۱۱)۔ اس کے بعد ہی ہم اللہ پاک کی مدد و تائید کے مستحق ہوں گے۔

اس کوشش میں تعلیم کا بنیادی مقام ہے۔ بغیر تعلیم کے نہ ماضی اور نہ حال میں کسی فرد یا قوم نے ترقی کی ہے اور نہ مستقبل میں تعلیم کے بغیر کوئی فرد یا قوم ترقی کر سکے گی۔ لیکن ہم مسلمانان ہند تعلیم کے تئیں عرصۂ طویل سے سنجیدہ نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھ المیہ ہے کہ پچھلے دو سو سال سے ہم نے دنیا سے کٹ کر ایک ایسا نظام تعلیم ایجاد کر لیا ہے جو آج کی دنیا سے کٹا ہوا ہے اور جسے دنیا اور خود ہماری حکومت تسلیم نہیں کرتی ہے۔ تعلیم وہی ہے جو ہم کو دین کے ساتھ دنیا سے بھی جوڑے اور جس زمانے میں ہم رہ رہے ہیں اس کا صحیح ادراک ہمیں دے تاکہ ہم اپنے مسائل کو بخوبی حل کر سکیں اور دوسروں کے سامنے اپنے موقف کو طاقتور طریقے سے رکھ سکیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے مدارس کی تعلیم ہم کو یہ نہیں سکھاتی ہے۔

سچر کمیٹی نے مدارس میں جانے والے مسلم طلبہ کی تعداد تقریباً ۴ فیصد بتائی ہے، لیکن میرے

خیال میں اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ سچر کمیٹی کو پوری معلومات نہیں ملی۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ سچر رپورٹ کے مطابق دلی میں صرف چند مدرسے ہیں جن میں ۴۴۳ لڑکے اور ۷۰ لڑکیاں پڑھتی ہیں جبکہ ہر واقف کار جانتا ہے کہ دلی میں سینکڑوں چھوٹے بڑے مدارس ہیں جن میں ہزاروں بچے پڑھتے ہیں۔

ہر فرد، خاندان اور معاشرے کو مسلسل اپنا محاسبہ کرنا چاہئے کہ جہاں وہ پہنچ چکا ہے یا کھڑا ہے، وہ پڑاؤ درست بھی ہے یا نہیں۔ آگے کی منزلیں ابھی سر کرنی ہیں یا جہاں پہنچ چکے ہیں، وہی کافی ہے۔ جو بات فرد، خاندان اور معاشرے کے بارے میں صادق آتی ہے، وہی اداروں اور قوموں کے بارے میں صحیح ہے۔ جو قومیں اور ادارے ایک جگہ رک جاتے ہیں، ان میں گراوٹ آنے لگتی ہے اور گھن لگنے لگتا ہے اور جلد ہی وہ زمانے کی نظر میں بے معنی irrelevant ہو جاتے ہیں۔ ہمارے سامنے بہت سے گروہ اور قومیں ہیں جنھوں نے کبھی دنیا پر حکومت کی تھی اور آج حاشیے پر کھڑے ہیں۔

ہندوستان کے موجودہ مدارس پچھلے زمانے کی یادگار ہیں، یعنی آثار قدیمہ میں ان کا شمار ہونا چاہئے۔ وہ ایسا سامان ہیں جس کے استعمال کی تاریخ (expiry date) گزر چکی ہے۔ یہ مدارس انگریزوں کے برصغیر پر قبضے کے بعد اس نظریے سے بنائے گئے تھے کہ حکومت کے زیر انتظام اسکولوں میں اب انگریزوں کی مرضی اور ان کی خواہش کے مطابق تعلیم دی جائے گی جس سے ہمارے بچے بھٹک جائیں گے۔ ان مدارس سے پہلے ہمارے یہاں "پرائیویٹ" مدارس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ اسی کے ساتھ انگریز کی نفرت کی وجہ سے ان کی زبان سے بھی ہمیں شدید نفرت ہو گئی تھی حالانکہ کوئی مستقبل شناس یہ دیکھ سکتا تھا کہ یہ زبان اب عالمی زبان بننے جا رہی ہے کیوں کہ انگریزوں کا قبضہ دنیا کے بہت بڑے حصے پر ہو چکا تھا اور علوم وفنون میں تفوق کے ساتھ وہ عالمی تجارت پر بھی بڑی حد تک قابض ہو چکے تھے۔ انگریزی زبان کے ساتھ ہم نے جدید علوم کی بھی مخالفت کی اور انہیں اپنے مدارس میں بھٹکنے نہیں دیا حالانکہ ہم دہراتے نہیں تھکتے ہیں کہ ہمارے قدیم علماء دینی اور دنیاوی علوم دونوں کے ماہر ہوتے تھے۔ نتیجتاً مدارس سے ایسی کھیپ نکلنی شروع ہوئی جو اگرچہ علوم دینیہ میں ماہر تھی لیکن اپنے ارد گرد اور دنیا کے حالات سے ناواقف تھی۔ یہی نہیں بلکہ وہ رائج الوقت زبان سے بھی نابلد تھی۔ دھیرے دھیرے یہ فرق بڑھتا ہی گیا اور آزاد ہندوستان میں اردو کو حاشیہ پر کھڑے کرنے کے بعد اس میں شدید اضافہ ہو گیا اور ہم ملک کی

مین اسٹریم یعنی بنیادی دھارے سے کٹ گئے۔ یہاں تک ہمارے مدارس کے فارغین ریلوے ریزرویشن فارم اور بینک کا چک بھی بھرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے۔

اس سب کے باوجود ہم نے اپنے مدارس کے نظام تعلیم پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا اور کبھی کبھی کچھ لیپا پوتی کر کے سمجھ لیا کہ بس مقصد پورا ہو گیا۔ کچھ مسلمانوں نے اسکول اور کالج بلکہ یونیورسٹیاں بھی بنانی شروع کر دیں لیکن وہاں کے فارغین اسلامیات سے تو کیا اردو سے بھی نابلد ہو گئے۔ آج بھی ہمارے مدارس کے فارغین دنیا کے لئے تیار نہیں ہیں، نہ ہی وہ زمانے کی زبان اور عہد جدید کے رموز و قوانین سے واقف ہیں۔ دین کے نام پر بھی وہ صرف اپنے مسلک کی اندھی تقلید کرتے ہیں اور اسلام کے اصل ماخذ قرآن وحدیث کے بجائے ساری توجہ فقہ کی کتابوں پر مرکوز رکھتے ہیں۔ ہم مدارس کے بند کرنے کا مطالبہ ہرگز نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان میں ایسی تبدیلی چاہتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے علماء صحیح معنوں میں ملت اور ملک کے قائد بن سکیں۔

سالانہ دسیوں ہزار فارغین مدارس کی کھیپ میں سے اگر سو، پچاس بعض یونیورسٹیوں کے انسانی علوم کے شعبوں میں داخلہ پا جاتے ہیں یا دس، بیس سعودی عرب یا مصر کی بعض یونیورسٹیوں میں داخلہ پا جاتے ہیں یا چند کو عرب ممالک میں معمولی ملازمتیں مل جاتی ہیں تو اس سے فارغین مدارس کے جم غفیر کا بنیادی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کی اکثریت اپنی روزی روٹی کے لئے برسوں خاک چھاننے پر مجبور ہوتی ہے اور بالآخر کمترین پر راضی ہو کر حاشیے پر زندگی بسر کرتی ہے۔ مدارس ہماری ضرورت ہیں لیکن وہ ہماری صرف آدھی ضرورت پوری کرتے ہیں، جبکہ ہم کو ایسے مدارس کی ضرورت ہے جو عصر حاضر میں تعلیم کے متعلق ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کریں۔

حالات اور وقت کا تقاضا ہے کہ مدارس کے فارغین کا مسئلہ مدارس میں ہی حل کیا جائے یعنی نصاب تعلیم میں ہی ایسی بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں کہ مدارس کے فارغین، دین کے ساتھ، دنیاوی علوم سے بھی لیس ہوں اور مدارس کی اسناد کو حکومت وقت باقاعدہ طور سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے مساوی مان لے اور یہ فارغین مزید تعلیم اور ملازمت کے لئے وہ سب پا سکیں جو اسکولوں سے فارغ طلبہ کو حاصل ہوتا ہے۔ یوں ہمارے فارغینِ مدارس ملک اور بیرون ملک کے تمام وسیع امکانات سے مستفید ہو سکیں گے۔

بدلتے ہوئے حالات اور ضرورتوں کے مدنظر مدارس کے نصاب میں بنیادی تبدیلی آنی چاہئے

اور یہ کام مستقل ہوتے رہنا چاہئے جیسے اسکولوں کے نصاب میں مستقل حسب ضرورت نئی نئی چیزیں داخل ہوتی رہتی ہیں۔ عربی، اردو، فارسی، دینیات، تفسیر، فقہ وغیرہ کے ساتھ مدارس کے طلبہ کو وہ سارا کورس پڑھایا جانا چاہئے جو اسکولوں کے طلبہ پڑھتے ہیں۔ مدارس کے جو فارغین دینی علوم میں ماہر ہونا چاہتے ہیں، ان کے لئے مختلف علوم دینیہ میں ۳۔۴ سال کا "تخصص" کورس ہونا چاہئے جس میں وہ حسب خواہش علوم قرآن، حدیث، فقہ اور عربی زبان وادب وغیرہ میں عبور حاصل کر کے باقاعدہ عالم یا مفتی یا عربی زبان کے مدرس بن سکیں گے، جبکہ تخصص میں داخلہ نہ لینے والے طلبہ اپنی مزید تعلیم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جاری رکھ سکیں گے یا مختلف میادین میں ملک کے اندر اور باہر ملازمت تلاش کر سکیں گے۔ ایسی تبدیلی کے بعد فارغین مدارس کے سامنے صرف تدریس وامامت کے دروازے نہیں کھلے ہوں گے بلکہ ساری دنیا ان کا میدان ہوگی۔

مدارس کے نصاب میں ایسی تبدیلی آنی چاہئے کہ آدھا وقت عربی اور علوم دینیہ کو دیا جائے اور باقی آدھا وقت علوم جدیدہ اور انگریزی وہندی وریاضیات وغیرہ کو دیا جائے۔ پڑھائی ظہر کے وقت ختم نہ ہو بلکہ عصر تک جاری رہے۔ یہ طریقہ کار کوئی عجوبہ نہیں ہے بلکہ دنیا کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی اسلامی درسگاہ جامعۃ الازہر میں عرصے سے نافذ ہے۔ مشیخۃ الازہر (شیخ الازہر کے آفس) کے تحت مصر کے تمام علاقوں میں ایسے ہزاروں اسکول یا مدرسے چلتے ہیں جن کو المعاہد الازہریۃ کہتے ہیں۔ ایسے اسکول مصر کے باہر بھی قائم ہیں جیسے فلسطین اور انڈونیشیا میں۔ ان اسکولوں میں ادبی (آرٹس) اور علمی (سائنس) دونوں اسٹریم موجود ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی پڑھائی الگ الگ ہوتی ہے، مزید برآں نابینا بچوں کی تعلیم کا بھی الگ سے انتظام ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو مصری بچے کسی وجہ سے ملک کے باہر مقیم ہیں، ان کے امتحان دینے کا بھی انتظام ہے۔ پڑھائی پری اسکول (KG) سے شروع ہو کر، ابتدائی، اعدادی اور ثانوی تک چلتی ہے۔ ان اسکولوں سے فراغت کے بعد "الثانوية الأزهرية" (ازہری ہائی اسکول) کا سرٹیفکٹ ملتا ہے اور خود جامعۃ الازہر میں صرف اس سرٹیفکٹ کے حامل مصری طلبہ کو داخلہ ملتا ہے۔ لیکن اس سرٹیفیکٹ کے حامل شخص کو دنیا کی کسی بھی یونیورسٹی میں داخلہ مل سکتا ہے۔ اس سرٹیفیکٹ کے حامل کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی اسٹریم کے مطابق یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں میں داخلہ لے۔

ذرا سی ہمت اور بعد نظر سے ہم بھی ہندوستانی مدارس میں ایسا انقلابی نظام جاری کر سکتے ہیں

جس سے ہمارے مدارس اور فارغین کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ ماضی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور تحریک ندوۃ العلماء کے ذریعے اس طرح کی کوششیں کی گئیں لیکن ان سے مطلوبہ نتائج نہیں حاصل ہوئے۔ اپنی مدد آپ کرنے کے ساتھ ساتھ، اس سلسلے میں ہم حکومت سے، جو بہر حال ہماری اپنی حکومت ہے، مدد مانگ سکتے ہیں۔ یوپی اے گورنمنٹ نے اس سلسلے میں کوشش بھی شروع کی تھی کہ ایک "مرکزی مدرسہ بورڈ" بنایا جائے جس سے مدارس دینیہ ملحق ہوں اور وہی ایسی ڈگریاں دے جسے سرکاری طور پر منظوری حاصل ہو۔ افسوس ہے کہ بعض اندیشوں اور مصلحتوں کی وجہ اس اہم تجویز کو مسترد کر دیا گیا حالانکہ مذکورہ بورڈ سے انضمام مدرسوں کے لئے لازمی نہیں تھا اور ممبر بننے کے بعد بھی کوئی مدرسہ اس بورڈ کو کبھی بھی خیر باد کہہ سکتا تھا۔

آج ہمارے مدارس کسی سسٹم کے تابع نہیں ہیں بلکہ ہر مدرسہ ایک آزاد جزیرہ ہے جس کی وجہ سے یکسانیت اور معیار کا شدید فقدان ہے۔ جب تک ہمارے مدارس کی تعلیم زمانے کے مطابق اور ان کی اسناد سرکاری طور پر تسلیم شدہ نہ ہونگی، موجودہ انحطاط پذیر صورت حال باقی رہے گی اور ہمارے مدارس کے فارغین سوسائٹی کے لیڈر نہیں بن سکیں گے بلکہ سوسائٹی اور ملک کے لئے بوجھ بنے رہیں گے۔

مدارس کی تجدید اور امداد کا سلسلہ بھی مرکزی حکومت نے عرصے سے شروع کیا ہے جس سے تقریباً ۱۳ ہزار مدارس فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن صرف چند اضافی مواد جیسے انگریزی اور ہندی پڑھانے سے ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ضرورت ایک مکمل اور بنیادی تبدیلی کی ہے۔

چند یونیورسٹیوں نے، جیسے جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کچھ معروف مدارس کے فارغین کو ادبی یا انسانیات کے کورسوں میں قبول کرنا شروع کیا ہے لیکن سائنسی اور ٹکنیکل کورسز اب بھی ایسے طلبہ کے لئے بند ہیں۔ فارغین مدارس کو مین اسٹریم میں لانے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا برج کورس ایک اچھی پہل ہے اگرچہ اس کی وجہ سے فارغین مدارس کو کسی باقاعدہ کورس میں داخلے سے پہلے دو سال مزید لگانے پڑتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی اس طرح کا ایک کورس شروع کیا گیا ہے لیکن وہ اس معیار کا نہیں ہے جو علی گڑھ میں نظر آتا ہے۔ واضح ہے کہ محدود سیٹوں کی وجہ سے مدارس عربیہ کے تمام فضلاء اس طرح کی اسکیموں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں۔ برج کورس اصل مسئلے کا نعم البدل یا علاج نہیں ہے۔

اصل مسئلہ بہت بڑا ہے، کیونکہ فارغین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کے حل کے لئے ایک مستقل اور بنیادی حل مطلوب ہے جو مدرسے کے اندر ہی ممکن ہے۔ بڑی بیماریوں کا علاج مرہم یا اسپرین سے نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے لئے اینٹی بایوٹک دواؤں یا جراحی کی ضرورت ہوتی ہے۔

مثالی اور عملی ادارہ وہی ہے جس کا ذکر اوپر معاہد ازہریہ کی صورت میں آچکا ہے۔ ۲۰۰۹ میں، میں قاہرہ میں شیخ الازہر ڈاکٹر محمد سید طنطاوی سے ان کے دفتر میں ملا تھا اور ان سے ہندوستان میں الازہر یونیورسٹی کی شاخ قائم کرنے کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے معذوری ظاہر کی کہ جامعہ (یونیورسٹی) کا انتظام ان کے تابع نہیں ہے، البتہ وہ معاہد ازہریہ (ازہری اسکول) ہندوستان میں قائم کرسکتے ہیں۔ اس وقت میں ایک خاص وجہ اور سوچ کی بنیاد پر صرف یونیورسٹی کے بارے میں سوچ رہا تھا، اس لئے میں نے معذرت کی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی؛ مجھے فوراً ان کے آفر کو قبول کر لینا چاہئے تھا۔ شیخ طنطاوی کا انتقال مارچ ۲۰۱۰ میں ہو گیا اور اب ڈاکٹر احمد الطیب شیخ الازہر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس سلسلے میں ان سے سلسلۂ جنبانی کی جائے تو کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے۔

آج ہمارے سامنے یہ المیہ ہے کہ ملت کے عام آدمی علماء کو اپنا قائد اور رہنما مانتے ہیں لیکن یہ علماء ہماری قیادت کے اہل نہیں ہیں، کیونکہ وہ ملک اور دنیا کے حالات سے واقف نہیں ہیں۔ وہ حکومت اور دوسری قوموں کے قائدین سے آنکھوں میں آنکھیں ملا کر بات نہیں کرسکتے ہیں۔ وہ حکومت اور میڈیا کے سامنے ہمارے کیس کی صحیح وکالت نہیں کرسکتے ہیں۔ وہ ایسی زبان میں لکھتے، پڑھتے اور بولتے ہیں جس سے ملک کے دوسرے لوگ نا آشنا ہیں۔ وہ عربی بھی ٹھیک سے نہیں جانتے جس کو پڑھنے میں وہ دس۔ بارہ سال لگاتے ہیں جبکہ انگریزی میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے بچے دو تین سال میں انگریزی لکھنے اور بولنے لگتے ہیں۔۔ وہ پارلیمنٹ بھی پہنچ جاتے ہیں تو وہاں ایک اجنبی کی طرح رہتے ہیں اور برسوں منہ نہیں کھولتے ہیں جیسے پچھلے کچھ سالوں میں دو علمائے دین کا معاملہ رہا جو لوک سبھا کے ممبر تو ضرور بنے لیکن وہاں ان کی زبان نہیں کھلی۔ یہ سب بدلنا ہوگا اور یہ اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک ہمارے نظام مدارس میں بنیادی تبدیلیاں نہیں لائی جاتیں تاکہ وہاں سے ایسے لوگ نکل سکیں جو نہ صرف دین میں بلکہ دنیاوی امور میں بھی ہماری قیادت کے اہل ہوں۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہماری تقدیر بدل سکتی ہے۔

فیضی کی ترجمہ کردہ بھگوت گیتا کا ایک مختصر جائزہ

ڈاکٹر سرفراز احمد خان
اسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ فارسی، مانو لکھنؤ کیمپس
faraz.ipr@gmail.com

فارسی میں بھگوت گیتا کے تراجم کی روایت قدیم ہے۔ اس کا آغاز مغل سلطنت کے دور میں داراشکوہ کے فارسی ترجمے سے ہوتا ہے۔ بعد میں مختلف علمی و ادبی شخصیات نے بھی اسے فارسی میں منتقل کیا، جس سے گیتا کی تعلیمات فارسی زبان و تہذیب تک پہنچیں۔

اس کے علاوہ، مغل شہنشاہ اکبر نے سنسکرت ادب کو دربار میں اہمیت دی اور بھگوت گیتا سمیت مختلف سنسکرت متون کے فارسی تراجم کروائے۔ اکبر کے حکم سے جن کتابوں کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا ان کی تعداد مؤرخین نے پندرہ بتائی ہے۔ ان میں رزم نامہ کے علاوہ اتھر وید ہے جس کا ترجمہ ملا عبد القادر بدایونی نے کیا تھا۔ بھگوت گیتا کا ترجمہ فیضی نے کیا تھا۔ گنگا دھر کا ترجمہ ابو الفضل نے کیا تھا۔ یوگ بششٹ کا ترجمہ مولانا فرنیولی، کتھا سریتا ساگر کا ملا بدایونی، کشن جوشی کا ترجمہ ابو الفضل نے کیا تھا، جب کہ لیلاوتی اور نل دمن کا ترجمہ فیضی نے کیا تھا۔ مہیش موہانند کا ترجمہ ابو الفضل نے کیا تھا۔ سنگھاسن بتیسی، مہابھارت اور رامائن کو سنسکرت سے فارسی میں ملا عبد القادر بدایونی نے منتقل کیا تھا۔ سنگھاسن بتیسی کو "نامۂ خرد افزا" کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں کچھ دوسری کتابیں بھی اس زمانے میں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں قدیم مخطوطات میں بھگوت گیتا کے فارسی ترجمے ملے جنہیں محفوظ کیا گیا ہے۔ بھگوت گیتا دراصل سنسکرت زبان میں لکھی گئی تھی لیکن اپنی مقبولیت کی بنا پر اس کا دنیا کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ کتاب دراصل مہابھارت کا ایک حصہ ہے جسے اکبر کے حکم سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا اور جس کا دیباچہ ابو الفضل نے لکھا۔ اس ترجمہ کے فن ششم میں، جس کا نام بھیکم پرب ہے، میں بھگوت گیتا کا خلاصہ درج ہے۔ اس کے دو نسخے مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہیں۔ ایک میں دیباچہ نہیں ہے۔ عبد السلام کلکشن میں جو نسخۂ خطی ہے اس میں ابو الفضل کا

لکھا ہوا دیباچہ موجود ہے۔

افسوس ہے کہ فیضی کی ترجمہ کردہ بھگوت گیتا اب دستیاب نہیں ہے۔ لیکن فیضی نے بھگوت گیتا کا جو منظوم ترجمہ کیا تھا وہ مثنوی کی شکل میں آج بھی دستیاب ہے۔ اسے سنہ ۱۸۴۴ میں منشی رام سپرو نے زیور طبع سے آراستہ کیا۔ یوں تو یہ منظوم ترجمہ ہے لیکن خواننده کے لیے فیضی نے حاشیہ میں مشکل تراکیب اور الفاظ کی وضاحت بڑے حسن وخوبی سے کی ہے۔ محمد احمد خان نے جو گیتا کا فارسی ترجمہ سنہ ۱۹۵۷ میں کیا ہے اس کے حاشیہ میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ کچھ محققین کا یہ ماننا ہے کہ یہ منظوم ترجمہ فیضی کا نہیں ہے بلکہ مسیحی پانی پتی کا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> درین کتاب نام مترجم ذکر نشدہ وبدین جہت نمی توان گفت کہ ترجمہ از کیست۔ باوجود تجسس بسیار نسخۂ دیگری ازین ترجمہ نیافتم کہ معلوم گردد بدستِ چہ کسی ترجمہ شدہ است۔ دیگر ترجمۂ گیتا بفارسی منظوم است کہ بچاپ رسید وبہ علامہ فیضی منسوب می باشد امابرخی گویند ازوی نیست واز مسیح پانی پتی است[1]۔
>
> (اس کتاب میں مترجم کا نام نہیں بتایا گیا، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا ترجمہ کس نے کیا ہے۔ کافی تحقیق کے باوجود مجھے اس ترجمے کا دوسرا نسخہ نہیں ملا جس سے تعین کیا جاسکے کہ اس کا ترجمہ کس نے کیا ہے۔ گیتا کا فارسی میں ایک اور ترجمہ منظوم ہے جو شائع ہو چکا ہے اور علامہ فیضی سے منسوب ہے لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ان کا نہیں ہے بلکہ مسیح پانی پتی کا ہے۔)

فیضی کی ترجمہ کردہ ایک اور گیتا "گیتائی فیضی" کے نام سے بھی دستیاب ہے لیکن سرورق پر صرف فیضی کا نام ہے اور کوئی نسبت بظاہر فیضی سے اس ترجمہ کو نہیں ہے۔ منشی امرناتھ نے ۱۹۲۸ء میں دہلی سے اس ترجمہ کو "راز محضر" کے نام سے شائع کیا۔ اسی طرح اکبر کی ایماء پر ابوالفضل نے جو بھگوت گیتا کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا، اس کے متعلق بھی علماء میں اختلاف ہے کہ یہ ترجمہ ابوالفضل کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے حکم سے یہ ترجمہ کئی سنسکرت اور فارسی کے عالموں نے مل کر کیا جس کا دیباچہ ابوالفضل نے لکھا۔ لندن کے برٹش میوزیم میں جو نسخہ بھگوت گیتا کا ہے اس کے فہرست نگار ریو یو نے اس کو ابوالفضل کا ترجمہ بتایا ہے لیکن انڈین آفس لائبریری کے فہرست نگار ایتھے نے اسے داراشکوہ کا ترجمہ کردہ نسخہ بتایا ہے۔ یہ ترجمہ نثر میں ہے جو اصل

---

[1] بھگوت گیتا کا فارسی ترجمہ، مقدمہ از مولف ص: ی تا یا، تصحیح وتدوین محمد اجمل خان، مرتبہ انجمن روابط فرہنگی ھند، نئی دہلی، ۱۹۵۸ء

سنسکرت بھگوت گیتا کی طرح ۱۸ ابواب پر مشتمل ہے۔

داراشکوہ نے بھگوت گیتا کا ترجمہ نثر میں کیا ہے۔ اس کو فارسی کے دو مایہ ناز محققوں نے زیور طبع سے آراستہ کیا۔ سب سے پہلے محمد اجمل خان نے اور پھر سید محمد رضا جلالی نائینی نے پرمغز مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ یہ دونوں تراجم اصل کی طرح ۱۸/ ابواب پر مشتمل ہیں۔ لیکن ترجمے کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔ جلالی نائینی نے سنہ ۱۹۸۰ء میں کتاب خانہ طہوری تہران سے جس بھگوت گیتا کو شائع کرایا اس کا فارسی نام "سرود الٰہی" رکھا۔ یہ نثری ترجمہ ہے۔ اس اشاعت کی اساس جلالی نائینی نے تین مخطوطات کو بنایا جس میں سے پہلا نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے۔ دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں جس کی ۱۸۴۰ء میں داتارام نے کتابت کی تھی۔ اس فارسی ترجمے کو جلالی نائینی نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ صفحہ ۱ سے ۱۳۸ تک مرتب کا پرمغز مقدمہ ہے اور پھر دوسرے حصے میں داراشکوہ کی ترجمہ کردہ بھگوت گیتا کا متن شامل ہے جس میں ۱۸/ ابواب ہیں۔ ان دونوں فارسی تراجم کے علاوہ داراشکوہ کے ہم عصر عبدالرحمن چشتی نے بھی بھگوت گیتا کا ترجمہ "مرآت الحقائق" کے نام سے کیا جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ بھگوت گیتا کا ایک اور فارسی ترجمہ لچھمی نارائن ساکن آگرہ نے کیا۔ اس کے علاوہ اس نے برہم سوترا کا ترجمہ فارسی میں کیا جو ہندوستانی فلسفے سے متعلق ہے۔ اس کا نام اس نے "حقائق المعارف" رکھا۔

محمد اجمل خان کا شائع کردہ داراشکوہ کا وہ فارسی ترجمہ ہے جو اس نے فارسی میں منتقل کیا تھا۔ چونکہ وہ خود سنسکرت کا گیانی تھا اس لئے داخلی شواہد کی بنا پر ترجمہ زیادہ معتبر اور اہم ہے۔ انجمن روابط فرہنگ ہند نئی دہلی نے یہ نسخہ ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ اس کا دیباچہ ایران میں ہندوستان کے سابق سفیر کبیر ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے۔ اس کے پرمغز مقدمے میں ڈاکٹر اجمل خان نے نہایت خوش اسلوبی سے ترجمے کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی ہے اور پھر داراشکوہ کے ترجمہ کردہ نسخہ ص ۱ سے ۱۲۳ تک شامل کیا ہے۔ فارسی ترجمہ کی رو سے گیتا مندرجہ ذیل تین ابواب پر مشتمل ہے:

فصل اول: کرم مارگ یا راہ عمل خیر: اس میں کہا گیا ہے کہ ہر وہ کام جو رفاہ عام کے لیے کیا جائے جس سے دل وروح کو سکون ملے وہ خیر ہے۔ اور طالب حق اسی عمل خیر کے ذریعے محبوب حقیقی کے وصال کا طلب گار ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایثار و قربانی کو راہ عمل بناتا ہے اور خود غرضی سے پرہیز کرتا ہے۔ گیتا اور ویدانت دونوں میں درج ہے کہ اللہ روح کل ہے اور جو اس کو پہچان لے گا وہ انسانیت کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہو گا۔ اس فلسفے کی دو شاخیں ہیں: ایک وحدت الوجود (یعنی ھمہ اوست)

اور دوسرا وحدت الشہود (یعنی ھمہ از اوست)۔ بقول گیتا دونوں ایک ہیں اور ایک ہی حقیقت کے مظہر ہیں۔ عالم اسلام کے تمام بڑے فلسفیوں اور صوفیوں نے چاہے فارسی کے ہوں یا عربی کے، مثلاً مولانا روم، عطار، سنائی، حافظ و جامی یا ابن عربی یا علی ہجویریؒ، ان تمام مشائخ اور علماء و شعرا نے اسی کی تعلیم و تلقین کی ہے اور ان کی تعلیمات گیتا سے قدرے مماثلت رکھتی ہیں۔ یعنی بے لوث انسانیت کی خدمت اور عشق الٰہی کے جذبے سے سرشار جسم ہی خیر ہے۔

عاشق صنع خدا باقی بود عاشق مصنوع آں فانی شود

ترجمہ: خدا کی کاریگری (صنع) سے محبت کرنے والا باقی رہتا ہے (کیونکہ وہ دائمی ہے)، جبکہ (خدا کی) بنائی ہوئی اشیاء (مصنوع) سے محبت کرنے والا فانی (مٹ جانے والا) ہو جاتا ہے۔

بقول جلال الدین رومی:

شادباش ای عشق خوش سودائی ما ای طبیب جملہ علت ھای ما

ای دوای نخوت وناموس ما ای تو افلاطون وجالینوس ما

(خوش رہ ہمارے اچھے جنون والے عشق، اے ہماری تمام بیماریوں کے طبیب۔ تو جو کہ ہماری نخوت اور ناموس کی دوا ہے، تو جو ہمارا افلاطون اور جالینوس ہے)

فصل دوم: گیان مارگ یا راہ علم و عرفان: بھگوت گیتا میں ہے کہ حقیقی علم معرفت الٰہی ہے اور طبعی علوم مادّی اصولوں کو جاننے کا وسیلہ ہیں۔ سالک راہ حقیقت ہی عالم روحانی تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور نور معرفت حق کو پا سکتا ہے اور اسی کو یہ آگاہی ہو سکتی ہے کہ حقیقت ایک ہی ہے یعنی ذات باری تعالیٰ کی۔ جیسا کہ مرزا بیدل کے اس شعر سے ظاہر ہے:

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دین چرا ست از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

(میں اِسی حیرت میں سرگرداں ہوں کہ آخر کفر اور دین کی دشمنی کس وجہ سے اور کیوں ہے؟ کیونکہ کعبہ اور بتخانہ تو ایک ہی چراغ (کے نور) سے روشن ہیں)۔

فصل سوم: بھکتی مارگ یا راہ محبت و عشق: گیتا میں یہ تصور ہے کہ انسان کے لیے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ عشق ہے۔ ابتداء میں ان کے یہاں برہما یعنی خدا کی دو شکل تسلیم کی جاتی تھی۔ شیو اور وشنو۔ ان ہی کی عبادت ہوتی تھی۔ دھیرے دھیرے ان کو فراموش کر دیا گیا اور ان کے دو اوتار رام اور کرشن قرار پا گئے اور رام بھگتی اور کرشن بھگتی ان کا عام طریقہ ہو گیا۔ بھگوت گیتا کی رو سے وہ حقیقت اعلیٰ پرم یعنی حقیقت مطلقہ ہے۔ جس کے ساتھ کسی اضافت کی دوئی نہیں ہے۔

صوفیہ اسے ذات بحث کہتے ہیں۔ گیتا اور اپنیشد میں ہے کہ انسان کو نفس امارہ، خواہشاتِ نفسانی، غضب وغصہ، حرص ولالچ، گھمنڈ وتکبر پر قابو پانے سے نفس مطمئنہ حاصل ہوتا ہے اور پھر وہ ہر شئ میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے، کسی سے نفرت نہیں کرتا، دوسروں کی خدمت کے لیے جیتا ہے۔ صوفیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ حقیقی توحید غیر اللہ کو ترک کرنا ہے۔ خدا کی محبت کے ساتھ کسی دوسری شئ کی محبت دل میں نہیں رہ سکتی۔ بھگتی مارگ میں اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ ایشور ہر انسان کے اندر جلوہ گر ہے۔ جس نے اس کو پہچان لیا وہ کامیاب ہو گیا۔ اس کو حضرت علی نے یوں کہا ہے: ''مَنْ عَرَفَ نَفْسہُ فَقَدْ عَرَفَ رَبّہ ''یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

اس کے علاوہ بھگوت گیتا میں نفس کو قابو میں رکھنے کو سب سے بڑا ہتھیار مانا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو اگر انسان اپنے نفس پر کنٹرول کرلے تو زیادہ تر برائیوں کو روکا جاسکتا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ نفس کی خواہشات ہوتی ہیں۔ گیتا کی تعلیمات کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ شری کرشن نے کرم (کردار)، آستھا (عقیدت)، آچار (برتاؤ)، وچار (فکر) اور آہار (غذا) کے معاملہ میں معتدل راستہ اپنانے اور اسے ہر حال میں من کی چاہ کے مطابق نہ برتنے کی تلقین کی ہے۔

اسی کے ساتھ بھگوت گیتا میں ریاضت اور تپسیا کو بھی روحانی تزکیہ کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے۔ گیتا کے مطابق خدا سے تعلق قائم رکھنے کے لئے ہر وقت جسم کو تمام آسائشوں سے الگ اسی کی عبادت میں منہمک رہ کر ہی اعلی مدارج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے میں بزرگوں سے عقیدت، ان کی صحبت سے فیضیابی، تمام مذاہب کے لئے عقیدت واحترام جیسی تعلیمات بھگوت گیتا کا اہم حصہ ہیں۔ گیتا کے چوتھے باب کے ۳۴ویں اشلوک میں اس حقیقت کو بہت خوبصورت انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ علم وفراست بزرگوں کے پاس جاکر ان کی تعلیمات حاصل کرکے ہی حاصل ہوسکتی ہے اور یہ سب کچھ بغیر سیوا (خدمت) کے حاصل نہیں ہوسکتا۔

اخلاقیات کے حوالے سے بھگوت گیتا کے سترھویں باب کے اشلوک نمبر ۱۴ میں اپنے بزرگوں، والدین اور اساتذہ کی عزت واحترام کی تلقین کی ہے۔ خاص طور سے کئی اشلوکوں میں بزرگ والدین کی خدمت وعزت واحترام کا ذکر کیا ہے۔ صرف گیان (علم) حاصل کرکے انسان گیانی (عالم) نہیں بنتا ہے بلکہ اس کے لئے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر اس میں جلاء پیدا کرنا ضروری ہے اور اس کے ساتھ عمل کرنا بھی لازم ہے۔

کتاب کے آخری (اٹھارہویں) باب میں سنیاسی اور تیاگ کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بھگوان، ارجن کو یہ سمجھاتے ہیں کہ بے لوث انسان کا نام سنیاسی ہے اور سب کاموں کے پھل کو تیاگ کرنے کو سچا تیاگ کہتے ہیں۔ اسی باب میں دوسرے کی سیوا کو فرض سمجھ کے کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ اسی باب میں شری کرشن نے سُکھ کی تین قسموں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نزدیک جو سکھ شروع میں زہر کی طرح اور آخر میں امرت کی طرح ہو، جس سے روح اور عقل کو شانتی ملے، وہ سکھ ساتوک ہے۔ اسی طرح اندریوں کا سکھ جو شروع میں امرت کی طرح اور آخر میں زہر کی طرح ہو، اسے راجسی سکھ اور جو سکھ شروع سے آخر تک آتما کو صرف لالچ، نیند اور آلس میں ڈالے وہ تامسی سُکھ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ان کتابوں کی تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ سب سے پریم، محبت پیدا ہو جائے۔ کینہ، نفرت اور دشمنی سے دل صاف ہو جائے۔ اسلامی تصوف کا مقصد بھی یہی ہے۔ تمام صوفیہ اس بات پر متفق ہیں کہ ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اگر کوئی اللہ سے محبت کا دم بھرتا ہے اور اس کی مخلوق سے اچھے طریقے سے پیش نہیں آتا ہے تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔ تصوف اور بھگتی نے مل کر ہندوستان میں محبت وعشق، یک جہتی اور ہم آہنگی کی فضا کو تقویت بخشی۔ اس کی ترجمانی شیخ سعدی نے یوں کی ہے:

بنی آدم اعضای یک دیگرند — کہ در آفرینش ز یک گوہرند
جو عضوی بدرد آورد روگار — دیگر عضوہا را نماند قرار
تو کز محنت دیگراں بی غمی — نہ شاید کہ نامت نہند آدمی

(آدم کے بیٹے ایک جسم کے اعضا کی طرح ہیں، ابتدا ہی سے ایک ہی جوہر کے عنصر ہیں، جب کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچاتا ہے، تو اس کا دوسرا عضو بے قرار ہو جاتا ہے، تجھے اگر دوسروں کے غم کے فکر نہیں ہے، تو تجھے آدمی کہنا بھی مناسب نہیں ہے)

ماٰخذ

۱۔ بھگوت گیتا کا فارسی ترجمہ، مرتب: سید جلالی نائینی، کتاب خانہ طہوری، تہران، ۱۹۸۰ء

۲۔ بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ مرتب: منشی رام سپرو، ۱۸۴۴ء۔

۳۔ Prof. Chander Shekhar, *Some Important Translations of Sanskrit works in Persian & Arabic*, New Delhi, 2007

۴۔ Prof. Chander Shekhar, *Persian as a bridge between Sanskrit & Persian with special reference to Yoga Vashisht,* New Delhi.

احمد امین کی کتب ثلاثہ میں اسلامی فکری تاریخ

ڈاکٹر محمد یوسف میر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، کشمیر
mir.mohammadyousf@gmail.com

مصری ادیب احمد امین بیسویں صدی کے پہلے نصف میں عربی و اسلامی فکر کے نمایاں علم برداروں میں شامل تھے۔ وہ ان ممتاز مفکرین میں سے تھے جنہوں نے اسلامی تہذیبی تجدید کی دعوت دی اور ایک معتدل، متوازن اور خود مختار فکری دھارے کی بنیاد رکھی۔

احمد امین ابراہیم الطبّاخ ۱۸۸۶ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک ازہری استاد تھے جنہوں نے انہیں کم عمری ہی میں قرآنِ کریم حفظ کروایا۔ حفظ مکمل کرنے کے بعد انہوں نے امّ عباس ماڈل پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کی، اور چودہ برس کی عمر میں جامعہ ازہر میں داخل ہوئے۔ اگرچہ انہوں نے ازہری تعلیم میں نمایاں کامیابی حاصل کی تاہم سولہ برس کی عمر میں ازہر کو خیرباد کہہ کر تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوگئے۔ انہوں نے طنطا، اسکندریہ اور قاہرہ کے مختلف تعلیمی اداروں میں عربی زبان کے مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں انہوں نے مدرسہ القضاء الشرعی میں داخلہ لیا، جہاں سے چار سال بعد کامیابی کے ساتھ فراغت حاصل کی اور اسی ادارے میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں ان کی ملاقات نوجوانوں کے ایک علمی و فکری حلقے سے ہوئی جس کا مقصد عربی ثقافت کو فروغ دینا تھا۔ اس گروہ نے نہ صرف عربی تراث کو تحقیق، تدوین اور شرح کے ساتھ پیش کیا بلکہ یورپی فکر کے شاہکاروں کو بھی عربی قارئین تک پہنچایا۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں، طٰہٰ حسین کی سفارش پر احمد امین کو قاہرہ یونیورسٹی کے کلیۃ الآداب میں تنقیدِ ادبی کی تدریس کے لیے منتخب کیا گیا، اور بعد ازاں وہ اسی کلیہ کے ڈین بھی مقرر ہوئے۔ انتظامی ذمہ داریوں نے ان کے فکری منصوبے کو متأثر کیا، جس کے باعث انہوں نے ۱۹۴۰ء میں اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ آٹھ سال بعد انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ سے نوازا گیا۔

انہوں نے فلسفہ، ادب، تنقید، تاریخ اور تعلیم سمیت مختلف علمی میدانوں میں گراں قدر

خدمات انجام دیں۔ احمد امین پوری زندگی تحقیق، مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے یہاں تک کہ ۱۹۵۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ اپنے پیچھے ایک ایسا وقیع اور زرخیز فکری سرمایہ چھوڑ گئے جس سے بعد کی نسلوں نے بھرپور استفادہ کیا۔

احمد امین کی متعدد تصانیف نے عرب قارئین میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ تاہم ان کی وہ کاوشیں جنہوں نے انہیں عالمی سطح پر دوام بخش شہرت عطا کی دراصل اسلامی فکری زندگی کی تاریخ پر مبنی ان کی معروف سلسلۂ کتب ہیں، جو "فجر الاسلام"، "ضحیٰ الاسلام" اور "ظہر الاسلام" کے عنوانات سے منظرِ عام پر آئیں۔

ڈاکٹر محمد رجب البیومی نے اپنی کتاب "احمد امین: مؤرخ الفكر الإسلامي" میں نشاندہی کی ہے کہ احمد امین کی اصل علمی عظمت اور شہرت کا انحصار اسی سلسلۂ تصانیف پر ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی فکر کی تاریخ کو محض روایتی انداز میں بیان کرنے کے بجائے ایک نئے تحقیقی منہج، تازہ اسلوب اور جدت آمیز نتائج کے ساتھ پیش کیا۔ ان کی تحریر میں تجزیاتی بصیرت نمایاں ہے، جس کے ذریعے انہوں نے امتِ مسلمہ کی عقلی و فکری ارتقاء کو ایک منظم اور بامعنی صورت میں اجاگر کیا۔ یہ کارنامہ اس سے قبل اس میدان میں کم ہی دیکھنے میں آیا تھا۔ اسی وجہ سے یہ سلسلۂ کتب بعد کے محققین اور ناقدین کے لیے ایک بنیادی مأخذ کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اسلام اور اس کی تاریخ پر گزشتہ صدیوں میں بے شمار کتب تصنیف کی گئیں، جن کا احاطہ ممکن نہیں۔ تاہم بیسویں صدی کے پہلے نصف تک کم از کم ایک یہی مجموعہ ایسا تھا جسے اہلِ علم کا غیر معمولی اعتماد حاصل رہا، کیونکہ اس میں اسلامی فکری زندگی کی تاریخ کو واضح، جامع اور مربوط انداز میں پیش کیا گیا تھا اور اسے براہِ راست اسلامی تاریخ کے تسلسل سے وابستہ کر کے بیان کیا گیا تھا۔

یہ سلسلہ، جس کی اشاعت کا آغاز ۱۹۲۹ء میں ہوا، احمد امین نے اس انداز سے مرتب کیا کہ اس کے پسِ پردہ کارفرما محرکات کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ انہوں نے خود اس علمی کاوش کی بنیاد اور اپنے ذاتی محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے یہ بات سیکھی کہ جامعہ اور مدرسہ کے درمیان بنیادی فرق تحقیق کا ہے؛ مدرسہ محض کتابوں میں موجود علم کی تعلیم دیتا ہے، جبکہ جامعہ انہی کتابوں کا مطالعہ اس غرض سے کرتی ہے کہ ان سے نئے حقائق اخذ کیے جائیں۔ مدرسہ علم کی آخری حد تک پہنچے ہوئے نتائج سے روشناس کراتا ہے، جبکہ جامعہ کا مقصد نامعلوم کو دریافت کرنا، موجودہ علمی نتائج پر تنقید کرنا، ان میں ترمیم کرنا، نئے افکار کو قدیم کی جگہ قائم کرنا اور

فرسودہ آراء کو منہدم کر کے ان کی جگہ نئے نظریات تعمیر کرنا ہے۔[۱]

اسی تصور نے انہیں ایک وسیع تحقیقی منصوبے کی بنیاد رکھنے پر آمادہ کیا، جسے انہوں نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور عبد الحمید العبادی کے ساتھ مل کر ترتیب دیا۔ اس منصوبے کے تحت یہ طے پایا کہ اسلامی زندگی کا مطالعہ اس کے ظہور کے ابتدائی دور سے لے کر مختلف ادوار میں تین پہلوؤں—ادبی، تاریخی اور عقلی—سے کیا جائے۔ اس تقسیم کے مطابق طٰہٰ حسین ادبی زندگی کا جائزہ لیتے، عبد الحمید العبادی تاریخی پہلو پر کام کرتے، جبکہ احمد امین نے فکری و عقلی زندگی کے مطالعے کی ذمہ داری سنبھالی۔

لیکن حالات نے اس منصوبے کو مختلف رخ دے دیا، اور یوں احمد امین ہی واحد شخصیت ثابت ہوئے جو اپنے حصے کے کام کو مکمل کرنے میں کامیاب رہے، جبکہ ان کے رفقاء ذاتی حالات کے باعث اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ احمد امین نے پوری یکسوئی کے ساتھ اس علمی سفر کا آغاز کیا اور اس کے پہلے حصے کی تیاری میں مصروف ہو گئے، جسے انہوں نے "فجر الاسلام" کا نام دیا۔ اس حصے کی تکمیل میں انہیں دو سال کا عرصہ صرف کرنا پڑا۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ احمد امین نے اس عظیم علمی کام کی تیاری میں غیر معمولی سنجیدگی، محنت اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اس کی تالیف میں بے پناہ مشقت برداشت کی اور اپنی روزمرہ زندگی کا بہترین حصہ اسی کام کے لیے وقف کر دیا۔ وہ خود اپنے الفاظ میں اس محنت و انہماک کی بہترین عکاسی کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

> میں صبح آٹھ بجے کام شروع کرتا، کتابوں کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتا، انہیں الٹ پلٹ کر ان کے متون اخذ کرتا اور ان سے اپنے مطلوبہ نکات کشید کرتا رہتا، یہاں تک کہ ایک بجے تک مسلسل بیٹھا رہتا—ایک ایسی نشست جس میں، میں خود کو اور اپنے اردگرد کی ہر چیز کو بھول جاتا۔ یہی معمول ان دنوں میں رہتا جب مجھے جامعہ میں تدریسی فرائض انجام نہیں دینے ہوتے، یہاں تک کہ متعلقہ حصہ مکمل ہو جاتا۔[۲]

انہوں نے اپنی ان علمی کاوشوں کو جاری رکھتے ہوئے اس سلسلے کے دوسرے مرحلے، یعنی "ضحیٰ الاسلام" کی تیاری کا آغاز کیا۔ یہ تصنیف تین ضخیم اجزاء پر مشتمل ہے اور اپنی وسعت و گہرائی کے اعتبار سے احمد امین کے تحقیقی منہج کی ایک نمایاں مثال پیش کرتی ہے۔

اس منصوبے کی تیاری میں احمد امین نے نہایت منظم اور سائنسی طریقۂ کار اختیار کیا۔ وہ مختلف

---

[۱] احمد امین، حیاتی، قاہرہ، ۲۰۱۱، ص ۱۴۹۔

[۲] ماخذ سابق، ص ۱۵۰۔

موضوعات کے لیے الگ الگ فائلیں تیار کرتے اور ہر فائل پر متعلقہ عنوان درج کرتے ــــ مثلاً ایک فائل "معتزلہ" کے نام سے، دوسری "خوارج"، تیسری "ادب میں لونڈیوں کے اثرات"، چوتھی "ہندی ثقافت" وغیرہ۔ اس کے بعد وہ ان موضوعات سے متعلق بنیادی اور مستند مآخذ کا مطالعہ کرتے، جیسے "الاغانی"، جاحظ کی "الحیوان"، ابن قتیبہ کی تصانیف، جاحظ کے رسائل، ابن المقفع کی کتب اور دیگر اہم مصادر۔

مطالعے کے دوران جب انہیں کوئی اہم اقتباس یا مفید نکتہ ملتا تو وہ اسے مکمل عبارت کی صورت میں نقل کرنے کے بجائے اس کا خلاصہ یا مرکزی مفہوم ایک چھوٹی پرچی پر درج کرتے اور ساتھ متعلقہ کتاب کا صفحہ نمبر بھی لکھ دیتے۔ بعد ازاں وہ اس پرچی کو متعلقہ موضوع کی فائل میں محفوظ کر دیتے۔ جب تحریر کا مرحلہ آتا تو وہ ہر موضوع کی فائل کا از سرِ نو جائزہ لیتے، ان نوٹس کو منطقی ترتیب سے منظم کرتے اور اسی ترتیب کے مطابق اپنی تحریر کو تشکیل دیتے۔

مزید برآں، مسودہ مکمل ہونے کے بعد وہ اپنے کام کا باریک بینی سے تنقیدی جائزہ لیتے، اس میں اصلاح کرتے، اغلاط کو درست کرتے اور ترتیب کو بہتر بناتے تاکہ متن زیادہ مربوط اور معیاری ہو جائے۔ اسی منظم، محنت طلب اور تحقیقی اسلوب کے تحت انہوں نے تقریباً دو برس کے عرصے میں "ضحیٰ الاسلام" کے تینوں اجزاء مکمل کر لیے، جو ان کی علمی بصیرت اور غیر معمولی استقامت کا روشن ثبوت ہیں۔

جن موضوعات پر احمد امین نے اس تاریخی سلسلے میں بحث کی ہے، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ فجر الاسلام: یہ اس سلسلۂ کتب کی پہلی کڑی ہے، جس میں احمد امین نے صدرِ اسلام سے لے کر اواخرِ عہدِ اموی (۶۲۲–۷۵۰ء) تک کی اسلامی فکری زندگی کا محققانہ اور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے عربوں کی عقلی و فکری زندگی کا سائنسی انداز میں تجزیہ کیا اور اس دور کی فکری، ادبی اور دینی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس عہد کے عرب معاشرے کو اس کی اصل فطرت اور حقیقی مزاج کے ساتھ نمایاں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو عرب علماء اور مستشرقین دونوں حلقوں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

"فجر الاسلام" سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں عہدِ جاہلیت کے عربوں کے حالات و خصوصیات بیان کی گئی ہیں، جبکہ دوسرے باب میں اسلام اور اس کے عرب معاشرے پر اثرات

کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے اور چوتھے ابواب میں بالترتیب فارس، یونان اور روم کی تہذیبوں اوران کے عربوں پر اثرات کا تذکرہ ہے۔ پانچواں باب اسلامی معاشرے میں علمی تحریک اور اس کے مراکز کی نشاندہی کرتا ہے جب کہ چھٹا باب اسی دور کی دینی تحریکات پر روشنی ڈالتا ہے۔ ساتواں اور آخری باب ان مختلف دینی فرقوں کا تعارف پیش کرتا ہے جو فجر اسلام کے زمانے میں اسلامی معاشرے میں وجود پذیر ہوئے۔[۳]

۲۔ ضحی الاسلام تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ اس کے مباحث بنیادی طور پر عباسی عہدِ اوّل میں عرب معاشرے کی عقلی، اعتقادی، سماجی اور ثقافتی زندگی، علمی تحریکات اور دینی فرقوں کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ عہد تقریباً ایک صدی پر محیط ہے، یعنی ۷۵۰ء سے ۸۴۷ء تک۔ اس کتاب میں احمد امین نے نہایت بصیرت کے ساتھ مختلف تہذیبی اثرات –جیسے فارسی، ہندی، یونانی، رومی اور عربی ثقافت– نیز دینی ثقافتوں پر روشنی ڈالی ہے، جس کے نتیجے میں قاری کو اس دور کی ہمہ جہت سماجی وفکری زندگی کی ایک واضح اور جامع تصویر حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے سماجی زندگی کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے، جس کی نمایاں صورتیں درج ذیل ہیں:

- پہلے حصے میں عباسی عہدِ اوّل کی سماجی زندگی اور مختلف ثقافتوں کا بیان ملتا ہے۔
- دوسرے حصے میں علوم کی پیدائش اور ان کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔
- تیسرے حصے میں معتزلہ، شیعہ، مرجئہ اور خوارج جیسے دینی فرقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ان کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی وفکری مزاج کا مختصر مگر جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔[۴]

۳۔ ظہر الاسلام: احمد امین نے وہ سلسلۂ بحث آگے بڑھایا ہے جو "ضحیٰ الاسلام" میں ختم ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے عباسی عہدِ ثانی (۸۴۷ء۔ ۱۰۲۲ء) کی سماجی اور عقلی زندگی، علمی وادبی تحریکات اور دینی فرقوں کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں انہوں نے وہی منہج اختیار کیا ہے جو "ضحیٰ الاسلام" میں اپنایا تھا۔ یہ تصنیف چار اجزاء پر مشتمل ہے، جو ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۵ء کے درمیان شائع ہوئے۔

پہلے حصے میں عہدِ متوکل سے چوتھی صدی ہجری کے اختتام تک کی سماجی زندگی اور فکری

---

[۳] احمد امین، فجر الاسلام، مکتبہ احسان، لکھنو، ۲۰۱۴۔

[۴] احمد امین، ضحی الاسلام، مکتبہ احسان، لکھنو، ج ۱، ص ۴-۸۔

مراکز کا جائزہ لیا گیا ہے۔ احمد امین اس ضمن میں یہ نکتہ پیش کرتے ہیں کہ عرب ابتدا میں فلسفے سے ناواقف تھے، کیونکہ یہ ان کی فطرت کا حصہ نہ تھا؛ تاہم یونانی، فارسی، ہندی اور رومی تہذیبوں سے اختلاط کے بعد وہ اس علم سے آشنا ہوئے۔

دوسرا حصہ چوتھی صدی ہجری میں علوم، فنون اور ادب کی تاریخ پر مشتمل ہے، جسے مصنف نے نہایت جامع اور دقیق انداز میں پیش کیا ہے۔

تیسرا حصہ اندلس سے متعلق ہے جس میں فتحِ اندلس سے لے کر مسلمانوں کے زوال تک وہاں کی عقلی و فکری زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے، اور اہم علوم و فنون کے ساتھ نمایاں اہلِ علم و ادب — مثلاً ابن زیدون اور ولّادۃ بنت المستکفی[۵] — کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

چوتھا حصہ مختلف دینی و فکری تحریکات پر مشتمل ہے، جن میں اہلِ سنت، شیعہ، معتزلہ، مرجئہ، صوفیہ اور فقہاء شامل ہیں۔ اس حصے میں احمد امین کے معتزلی رجحان کی جھلک بھی ظاہر ہوتی ہے، جہاں وہ عقل و فکر کی بنیاد پر اسلام کو سمجھنے کی وکالت کرتے ہوئے تقلیدِ محض کے بجائے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔[۶]

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس عظیم علمی سلسلے نے اہلِ علم اور ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل کی۔ متعدد اہلِ قلم اور محققین نے اس پر قیمتی آراء پیش کیں، یہاں تک کہ بعض ناقدین کے نزدیک اسلامی فکر کی ابتدائی تاریخ کے باب میں اس مجموعے سے بڑھ کر کوئی کام نہیں ہوا۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اگر احمد امین کی یہی تصانیف ہوتیں تو بھی ان کی علمی شہرت کے لیے کافی تھیں۔

ڈاکٹر زکی المحاسنی نے اس سلسلے کی اہمیت کو یوں سراہا ہے:

> احمد امین کی یہ کاوشیں ہماری جدید فکری زندگی کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ اور ان موضوعات پر لکھنے والوں کے لیے ناگزیر مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں، جن میں انہوں نے نہایت دیانت اور سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کی جستجو کی ہے۔[۷]

اسی طرح عربی ادب کے ممتاز ادیب و نقاد طٰہٰ حسین نے کہا:

---

[۵] ولّادۃ بنت المستکفی اور شاعر و ادیب ابن زیدون کی محبت کا قصہ بہت مشہور ہے۔ یہ محبت پروان نہ چڑھ سکی لیکن ابن زیدون کے اشعار باقی رہے (مدیر)

[۶] احمد امین، ظہر الاسلام، مکتبہ احسان، لکھنؤ، ۲۰۱۸ء، ج ۱، ص ۳-۸۔

[۷] ڈاکٹر زکی المحاسنی، محاضرات عن احمد امین، قاہرہ، ص ۱۷۔

احمد امین نے "فجر الاسلام"، "ضحیٰ الاسلام" اور "ظہر الاسلام" کی صورت میں جدید دنیا کو ایک ایسا قیمتی خزانہ عطا کیا ہے جو اپنی وسعت، بقا اور اثر آفرینی کے اعتبار سے بے مثال ہے۔[۸] جس شخص نے "فجر الاسلام"، "ضحیٰ الاسلام" اور "ظہر الاسلام" جیسی تصانیف پیش کی ہوں، وہ اپنے ان آثار کے ذریعے زمانے میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔[۹]

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے بھی ان کتابوں کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا :

"فجر الاسلام" اور "ضحیٰ الاسلام" اسلامی تہذیب کے ابتدائی ادوار میں علم و ثقافت کی تاریخ پر لکھی گئی جدید دور کی نمایاں ترین کتب میں شمار ہوتی ہیں۔[۱۰]

یہ سنہری سلسلہ ادبی و علمی حلقوں میں وسیع پیمانے پر مقبول ہوا اور اہلِ علم نے اس پر نہایت مثبت آراء پیش کیں۔ تاہم اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ بعض علماء نے اس پر سخت تنقید بھی کی۔ ان کے نزدیک احمد امین نے بعض مقامات پر صحیح احادیث، خصوصاً بخاری کی روایات کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا اور بعض صحابہ، بالخصوص حضرت ابوہریرہؓ کی عدالت پر سوالات اٹھائے۔ مزید برآں، ناقدین نے "فجر الاسلام" اور "ضحیٰ الاسلام" میں بعض ایسی اغلاط کی نشاندہی بھی کی ہے جنہیں وہ قابلِ اعتراض قرار دیتے ہیں۔[۱۱]

مصادر و مراجع

۱۔ احمد امین، فجر الاسلام، مکتبہ احسان، لکھنؤ، ۲۰۱۴م۔

۲۔ احمد امین، حیاتی، مؤسسۃ ہنداوی للتعلیم والثقافۃ، قاہرہ، ۲۰۱۱م۔

۳۔ احمد امین، ضحی الاسلام، مکتبہ احسان، لکھنؤ، ۲۰۱۴م۔

۴۔ احمد امین، ظہر الاسلام، مکتبہ احسان، لکھنؤ، ۲۰۱۸م۔

۵۔ ڈاکٹر زکی المحاسنی، محاضرات عن احمد امین، جامعۃ الدول العربیۃ، قاہرہ، ۱۹۶۳م۔

۶۔ انور الجندی، جیل العمالقہ والقمم الشوامخ فی ضوء الاسلام، دار الاعتصام، قاہرہ، ۱۹۷۰م۔

---

[۸] طہ حسین، مقدمہ فجر الاسلام، ص ۶-۱۳۔

[۹] احمد امین، حیاتی، قاہرہ، ص ۲۳۴۔

[۱۰] التاریخ مکملہ بجب اَن یکون
https://historyasitshouldbe1987.blogspot.com/2014/10/blog-post_14.html

[۱۱] انور الجندی، جیل العمالقۃ والقمم الشوامخ فی ضوء الاسلام، دار الاعتصام، ص ۹۱۔

اخبار علمیہ

ہندوستانی ثقافت کے عربی مصادر پر سیمینار

ہندوستان شروع سے ہی بیرونی ممالک کے علماء و فلاسفہ، بالخصوص عرب مؤرخوں، جغرافیہ دانوں اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اس کی اہم وجہ اس سرزمین کی علاقائی و جغرافیائی خصوصیات، موسمی و طبیعی اوصاف اور یہاں کے باشندوں کی علم و تحقیق، تہذیب و ثقافت اور فکر و فن کی نشو و نما سے ان کی دیرینہ دلچسپی ہے۔ عرب مؤرخوں اور سیاحوں نے یہاں کے تاریخی، تمدنی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی حالات و مشاہدات اپنی کتابوں اور سفر ناموں میں تفصیل سے قلم بند کیے ہیں۔ اس سے ہندوستان کے عہد بہ عہد حالات سے واقفیت کا نہ صرف موقع بہم پہنچتا ہے بلکہ ہندوستان کی بزم رفتہ کے ساتھ ساتھ ماضی قریب کی سچی کہانیوں کے افہام و تفہیم اور مطالعہ و تجزیے میں مدد بھی ملتی ہے۔ موجودہ ملکی و وطنی صورت حال میں، جب کہ ہندوستان کی گذشتہ آٹھ سو سالہ تاریخ کو مسخ کرنے کی منظم کوشش کی جارہی ہے، اس موضوع کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبۂ عربی نے اسی احساس کے تحت ۲۴۔ ۲۵ مارچ ۲۰۲۶ء کو "ہندوستانی تاریخ و ثقافت کے عربی مصادر" کے موضوع پر دو روزہ بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا۔ اس سیمینار میں ملک کے مختلف حصوں اور بیرون ملک مصر، الجزائر، لیبیا، سعودیہ اور قطر سے کل ۵۵ مقالہ نگاروں نے حصہ لیا۔ بیرون ملک کے تمام اور ملک کے بھی متعدد مقالہ نگاروں نے آن لائن مقالے پیش کیے۔ دارالمصنّفین سے راقم نے شرکت کی۔ مقالات زیادہ ہونے کے سبب مقالہ خوانی کے اجلاس بہ یک وقت دو سیشن میں کرائے گئے۔ چند ایک کو چھوڑ کر تمام مقالات عربی اور دو مقالے انگریزی میں پڑھے گئے۔

افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ہیفاء شاکری اور صدارت پروفیسر زبیر فاروقی نے کی۔ مہمان خصوصی پروفیسر کفیل احمد قاسمی (اے ایم یو) تھے۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر نسیم اختر نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز کی ڈین پروفیسر نشاط منظر کے خطاب کے بعد پروفیسر ثناء اللہ ندوی (اے ایم یو) کے جامع اور پرمغز کلیدی خطبہ سے حاضرین بطور خاص مستفید ہوئے۔ اس اجلاس میں پروفیسر نسیم اختر کی کتاب "اسهامات الجامعة فی ترویج لغة الضاد

والثقافة العربية فی الهند"، ڈاکٹر ہیفاء شاکری کی مترجمہ کتاب "الجامعة الملية الإسلامية"، پروفیسر اورنگ زیب اعظمی کی "مواقع الحذف فی القرآن" اور ڈاکٹر دردانہ شاہین کی کتاب "اپولو موومنٹ اینڈ عربک پوئٹری" کا اجراء بھی عمل میں آیا۔

مقالہ خوانی کے کل چھ اجلاس ہوئے۔ ان اجلاسوں میں صدارت کے فرائض پروفیسر کفیل احمد قاسمی، پروفیسر حبیب اللہ خان، ڈاکٹر رضوان احمد، ڈاکٹر قطب الدین، پروفیسر اقبال احمد ندوی (حیدرآباد)، ڈاکٹر اصغر احمد، پروفیسر حسنین اختر اور نظامت کے فرائض بالترتیب ڈاکٹر مجیب اختر، ڈاکٹر زرنگار، ڈاکٹر عظمت اللہ ندوی، ڈاکٹر محمد عمیر، ڈاکٹر ہیفاء شاکری، ڈاکٹر اصغر محمود اور ڈاکٹر ثمینہ خانم نے انجام دیے۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر شفیق احمد ندوی اور نظامت ڈاکٹر محفوظ الرحمن ندوی نے کی۔

سیمینار میں مندرجہ ذیل عرب مقالہ نگار شامل تھے: پروفیسر جلال الدین الحفناوی (مصر)، پروفیسر علاء الدین اسماعیل، پروفیسر ھواریہ الحاج علی (الجزائر)، ڈاکٹر حوریہ نہاری (الجزائر)، ڈاکٹر محمود عمار (لیبیا)، ڈاکٹر سعید بن عثمان الملا (سعودیہ)، ڈاکٹر محمد محمود عبد القادر (مصر) اور ڈاکٹر مہدیہ عیسیٰ۔

جن مصادر کو اس سیمینار میں موضوع بحث بنایا گیا تھا ان میں چند درج ذیل ہیں۔ سبحة المرجان فی آثار ہندوستان، الثقافة الاسلامية فی الهند، بیرونی کی کتاب الہند، المظاهر الحضارية للهند في بعض الرحلات العربية في القرنين التاسع والعاشر الميلاديين، جنة المشرق ومطلع النورالمشرق، مروج الذهب ومعادن الجوهر، نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، حول العالم فی ۲۰۰ یوم، کتب الجاحظ، مکتوبات مُحَمَّد ثابت، تاريخ الهند: ثقافتها وفنونها، الهند والعرب فی العهد العباسی، السياحة فی کشمير، کتاب لقاء خليل، کافية ابن الحاجب فی شبه القارة الهندية، الهند وجيرانها مصدراً جديداً لتاريخ الهند، المسلمون فی الهند، رحلة ابن بطوطة اور مشاہدات فی الہند وغیرہ۔ اس کے علاوہ بعض مقالات میں بہ یک وقت متعدد مصادر کا مطالعہ و تجزیہ کیا گیا ہے۔ بعض میں ہندوستان کی اہم شخصیتوں مثلاً جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے متعلق عربوں کے تأثرات اور ایک مقالے میں قرون وسطی میں طب عربی پر آیورویدک کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد عمر فاروق (جے ایم آئی)، ڈاکٹر مجیب اختر (ڈی یو)، پروفیسر محی الدین آزاد (شبلی کالج)، ڈاکٹر محمد ارشد اعظمی، ڈاکٹر شمیم ارشاد اعظمی، ڈاکٹر حنا سعید، ممبئی اور راقم نے اردو میں مقالات پیش کیے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک کامیاب سیمینار تھا۔ ہندوستانی تاریخ و ثقافت کے قدیم و جدید عربی مصادر کے متعدد پہلوؤں پر مقالہ نگاروں نے بالعموم ناقدانہ اور دلچسپ گفتگو کی۔ (کلیم صفات اصلاحی)

اخبار عالم

افریقیوں کو غلام بنانا تاریخ کا سب سے بڑا جرم: اقوام متحدہ

تنظیم اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۲۵/ مارچ ۲۰۲۶ کو ایک تاریخی قرارداد پاس کی جس نے اعلان کیا کہ افریقیوں کو غلام بنانا اور ان کو بحر اٹلانٹک سے نئی دنیا لے جا کر بیچنا پوری تاریخ میں انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم تھا۔ یہ قرارداد افریقی ملک گھانا نے پیش کی تھی۔ اس کی دنیا کے ۱۲۳/ ملکوں نے تایید کی، تین ملکوں (امریکہ، اسرائیل اور ارجنٹائن) نے مخالفت کی جبکہ ۵۲ ملکوں نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔ ووٹنگ میں حصہ نہ لینے والوں میں یوروپی یونین کے تمام ممالک اور برطانیہ شامل تھے حالانکہ ان ممالک نے بھی اس جرم کا اقرار کیا۔ اس قرارداد سے افریقیوں کو افریقہ کے سواحل سے اغوا کر کے شمالی و جنوبی امریکہ لے جانے کے بارے میں گفتگو شروع ہو گئی ہے۔ افریقی ممالک آج تک اس ظلم عظیم کے آثار سے نپٹ رہے ہیں اور کالے لوگوں کے خلاف نسل پرستی بھی اسی ظلم عظیم کے نتیجے میں شروع ہوئی۔ قرارداد نے دنیا کے ممالک کو ایک ڈائیلاگ شروع کرنے کو کہا ہے تاکہ مظلومین کو معاوضہ دیا جاسکے۔ قرارداد نے ۲۵/ مارچ کو عبودیت مخالف دن کے طور سے دنیا بھر میں منانے کا فیصلہ بھی کیا تاکہ آنے والی نسلیں اس جرم عظیم کو یاد رکھیں۔

افریقیوں کو افریقی ممالک سے اغوا کر کے جدید دنیا میں لے جا کر غلام کے طور پر بیچنے کا عمل پندرہویں صدی سے انیسویں صدی تک جاری رہا۔ اس دوران ۱۵/ ملین افریقیوں کو زبردستی اغوا کر کے شمالی اور جنوبی امریکہ لے جایا گیا جہاں ان کو روئی، گنے اور کافی کے کھیتوں اور باغات میں انتہائی سخت حالات میں بیگار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ان غلاموں کے ساتھ انسان کے بجائے سامان کے طور سے معاملہ کیا جاتا تھا، ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور مالک کے مر جانے کے بعد ان کی ملکیت اس کے ورثہ کو منتقل ہو جاتی تھی۔ اتنے بڑے پیمانے پر افریقی ممالک سے ان کی آبادی خالی کرنے کی وجہ سے ان کی ترقی رک گئی جس کا اثر آج بھی باقی ہے۔ اس تجارت میں پرتگال، برطانیا، فرانس، اسپین، ہالینڈ اور ڈنمارک آگے آگے تھے۔ ان غلاموں کے استحصال سے جو دولت پیدا ہوئی اس سے یوروپین ممالک کی ترقی ہوئی اور انڈسٹریل انقلاب کے لئے سرمایہ فراہم ہوا۔

یوروپین ممالک کو ڈر ہے کہ غلامی کے لئے معاوضہ دینے کی ذمہ داری قبول کرنے سے جرائم میں ایک تاریخی ترتیب قائم ہو گی کہ غلام بنانے کے نتیجے میں دوسرے جرائم کا ارتکاب ہوا اور اسی طرح ماضی کے دوسرے جرائم کے لئے بھی معاوضہ دینے کا مطالبہ شروع ہو گا جبکہ موجودہ بین الاقوامی قانون اس طرح کی ترتیب کو قبول نہیں کرتا ہے۔ ترتیب قبول کرنے سے پرانے زمانے سے جرائم کی ذمہ داری کے تعین کا آغاز ہو گا۔ یوروپین ممالک کہتے ہیں کہ غلامی کے جرم کے اقرار سے قانونی اور مالی ذمے داری نہیں بنے گی۔ قرارداد کی تایید کرنے والے ممالک کا موقف ہے کہ اس جرم کے اعتراف کے نتیجے میں نہ صرف معافی مانگنی ضروری ہے بلکہ متاثرہ ممالک کو ہرجانہ بھی دینا ہو گا اور ان کی چوری کی ہوئی ثقافتی املاک کا جو یوروپ و امریکہ میں سرکاری اور نجی ملکیت میں موجود ہیں، ان کے اصل مالکوں کو واپس کرنا ہو گا۔ (الجزیرہ، ۲۶ مارچ ۲۰۲۶ء۔ تلخیص و ترجمہ: ظفر الاسلام خان)۔

دارالمصنّفین کا لائف ممبر بنئے

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی ملت اسلامیہ کا ایک بے نظیر علمی و تحقیقی ادارہ ہے۔ اس نے سیرت نبویؐ اور مختلف علوم و فنون پر بیش بہا لٹریچر فراہم کیا ہے۔ پچھلی ایک صدی کے دوران دارالمصنفین نے اب تک پونے تین سو کے قریب تصنیفات و تالیفات ملک کے سنجیدہ علمی حلقوں میں پیش کی ہیں۔ ادارے کا ماہنامہ ترجمان علمی "معارف" ملک و ملت کی ذہنی و فکری بیداری میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ دارالمصنفین کی بقا اور ترقی ملت اسلامیہ کے مصالح علیا میں شامل ہے۔ دارالمصنفین کے مشن سے جڑنے کا ایک طریقہ لائف ممبری قبول کرنا ہے۔ لائف ممبر شپ کی فیس پچاس ہزار روپے ہے۔ ہر لائف ممبر کو سیرۃ النبیؐ کی سات جلدوں کا سٹ پیش کیا جاتا ہے نیز رسالہ "معارف" بھی تاحیات جاری کیا جائے گا۔ دارالمصنفین کے حیاتی رکن بن کر اس تہذیبی مشن میں شامل ہوں۔

Darul Musannefin Shibli Academy
Shibli Road, Azamgarh 276001, U.P.
Contact: +91-81279-45267 (office). **Email:** info@shibliacademy.org
A/C Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH.
A/C No: 0504010100032752. **Bank Name:** PUNJAB NATIONAL BANK.
Branch: HEERPATTI - AZMAGARH (U.P.). **IFSC:** PUNB 0476100.
Bank Code: 476100

تبصرۂ کتب

راشد شاز، لایموت ایک خود نوشت: قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات: ۳۹۴ ، قیمت: ۳۰۰روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، پتہ ملی پبلکیشنز ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ادراک زوال امت، لستم پوخ اور کودرا جیسی کتابوں کے مصنف، موضوع اور مضمون اور ان دونوں میں سرایت کیے ہوئے افکار کی وجہ سے کچھ الگ نظر آنے والے اہل قلم میں شمار کیے جاتے رہے۔ بظاہر اسلام اور اس سے متعلق علمی وسیاسی وتہذیبی مسائل پر اظہار خیال ان کے تحریروں کا واحد حاصل ہے۔ اب یہ حاصل بھی کتنا لاحاصل رہا اس کی سرگزشت الگ ہے، سر دست ان کی کتاب، لایموت ہے جس کے ساتھ 'ایک خود نوشت' کے توضیحی الفاظ بھی ہیں۔ خود نوشت سے گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ بے شمار آپ بیتیوں کی طرح زندگی کے سفر کی یادوں پر مشتمل کتاب ہوگی جس میں روایتی نہ سہی پھر بھی وطن، خاندان، تعلیم اور پھر کاروبار زندگی کی وہ تفصیلات ہوں گی جو دنیا سے رخصت ہوتے وقت پسماندگان کے لیے نصیحت وعبرت کی باتوں کا ذخیرہ بن جاتی ہیں۔ لیکن زیر نظر کتاب خود نوشت ہونے کے باوجود آپ بیتی کی جگہ جگ بیتی میں بدل گئی۔ چونکہ صراحت نہیں اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ جب ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوا اسی زمانے میں کتاب کے مصنف کی زندگی کی صبح ہوئی۔ کتاب کی اشاعت کے وقت تک عمر مستعار کی ۷۔۶ دہائیاں تو یقیناً گذر چکیں۔ اس خاصی عمر کی زندگی کو ۵۴ فصلوں میں تقسیم کیا گیا اور آخری باب میں زبان غیر سے شرح آرزو کرتے ہوئے کہا گیا کہ آزاد ہندوستان میں رہتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے اندرون میں کوئی چیز ٹوٹ رہی ہو۔ تائید میں جے پرکاش نارائن کے یہ الفاظ بھی دہرائے گئے کہ "آزادی تو ملی لیکن یہ بے مزہ رہی"۔ بے مزہ بھی نہیں ایک گھٹن بھری اور نشاط سے محروم زندگی۔ مصنف نے آخری صفحہ پر نشاط روح سے محرومی کا اظہار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی ابتدا اور تعلیم اور پھر زندگی کی کشاکش سے ابھرنے والے حباب آسا اور مسلسل تغیر پذیر احوال وواقعات کے بیان میں جو احساس غالب اور زبان پر ہر آن مستولی رہا، وہ یہی نشاط زندگی کا فقدان ہے۔ تقسیم ملک کے زخموں کی بو اور کسک اعصاب میں ایسی سمائی کہ فرقہ وارانہ فسادات، ترکمان گیٹ،

ایمرجنسی، مسلم یونیورسٹی، مسلم مجلس مشاورت، ڈاکٹر فریدی ، مراد آباد کی عید گاہ، آسام میں نیلی کے مسلمانوں کا قتل عام، بابری مسجد، ہاشم پورہ، یہ سارے عنوان گویا کتاب زندگی کے لیے وقف ہوگئے۔ یہی نہیں فلسطین، یہود، افغانستان، بوسنیا جیسے خارجی مظاہر بھی اسی احساس کے رشتے میں یکساں نظر آئے، جو خود تنقیدی سے زیادہ اپنی ذات سے ماوراء ہر نقش کے عیبوں کی پردہ دری کا ترجمان بن گیا۔

یہودیوں کے ہولوکاسٹ، سیاہ فام غلاموں کا چوپایوں میں درج فہرست ہونا، اور نو آبادیاتی سامراج کے ذریعہ مقامی آبادیوں کی نسل کشی کا درد لے کر آزاد ہندوستان کے مسلمانوں پر گزرتی ہر صبح کو خون آلود دیکھنا حساسیت کی علامت ہے، لیکن انفرادیت یا الگ پہچان کی چاہ میں یہ کہنا کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر مظالم کا حقیقی احساس وادراک کبار زعما کو بھی کم ہی تھا۔ ان کے جسم جیل کی سلاخوں سے باہر تھے لیکن ان کے دل و دماغ میں آہنی سلاخیں کچھ اس انداز سے اگ آئیں تھیں کہ ان کے لیے اپنی حقیقی قدر و قیمت کا ادراک مشکل ہو کر رہ گیا۔ اس خود نوشت کے آغاز میں شدت احساس کا ایسا اظہار گویا پوری نوشت کے شدت پسند یا عام لہجے میں انتہا پسند ہونے کے بیانیہ کی بنیاد بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۲۴ء تک کی مسلمان نسل کے بارے میں یہ جملہ سرزد ہو گیا کہ ”شاید ہی کوئی ایسا خاندان ہو جو صوفی مجذوب یا دیوانہ کے وجود سے خالی رہ گیا ہو۔ یہی وہ فکر ہے جو فلسطین و اسرائیل کی آویزش کے نتیجے میں سانحہ مسجد اقصیٰ میں مسلمانوں کی الٰہیاتی فکر میں حد درجہ اتھل پتھل کا نظارہ کرنے لگتی ہے اور یہ احساس ظاہر کرنے سے ذرا بھی نہیں جھجکتی کہ اہل ایمان کی روحانی زندگی کا کس بل نکل چکا ہے پھر بھلا انہیں خدا کے لمس شفقت سے کیا واسطہ۔ مولوی نما سیاست دانوں کی شکل و صورت ان کی نماز، روزے سے دھوکہ نہ کھانے کی ترغیب“ اس کو زبان غیر سے اپنے ذہن کی گرمی یا گیس کا اخراج ہی کہا جائے گا۔ ایک کردار علامہ خورشید کا ہے ان کی زبان سے نکلے یہ الفاظ نقل کرنے میں کوئی تو داعیہ ہو گا کہ ”محکومی میں تو ہر جمعہ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی زخموں پر نمک پاشی کر رہا ہو“۔ مولانا مودودی کے ایک مضمون ”میرا بچپن“ کو پڑھنے کے بعد اگر کسی ذہن میں اس قسم کے خیال پیدا ہونے لگیں کہ ”کیوں نہ میں بھی اپنی سوانح حیات لکھ ڈالوں کیا عجب کہ اس طرح بڑا آدمی بننے کی کوئی سبیل نکل آئے۔ شرافت، نجابت، روحانیت اور تصوف کا مسالہ تو خاندانوں میں پہلے سے موجود تھا۔ پھر کیا ضرورت

تھی کہ بڑا آدمی بننے کے لیے چالیس اشرفیوں کے ساتھ سفر کیا جائے اور راستہ میں ڈاکوؤں کا ڈر اور جان کا دھڑکا لگا رہے۔ کیوں نہ مودودی صاحب کی طرح اپنے بچپن کے بیان کو اس طرح مرصع کیا جائے کہ اس پر کسی بڑے آدمی کی سوانح کا گمان ہو"۔ اس قسم کے جملوں میں الفاظ کا لف و نشر مرتب ہو یا غیر مرتب کچھ دیر کے لیے وقتی کیفیت یا کیفین کی حالت طاری کر سکتا ہے۔ اس قسم کے جملوں کو برتری اور کمتری کے احساسات کی میزان پر بھی رکھا جاسکتا ہے کہ "شخص اور خاندانی علوئے مرتبت کے اظہار پر والد صاحب نے روک لگادی"۔ قوم وملت کا مرثیہ پڑھنے میں گریہ وزاری کا اظہار فنون لطیفہ کا حصہ نہیں مگر اس قسم کے جملے توطنز ومزاح کی ادنی قبیل میں بھی شمار کے لائق نہیں کہ "ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی سماجی حیثیت کے باوجود خاندانی اعتبار سے اعلیٰ نسب نہ تھے۔" اسی وجہ سے مسلم لیگ میں ان کو قیادت کا مقام نہیں مل سکا اور یہ کہ ان کے لیے کانگریس کے سایہ عاطفت میں پناہ لینے کے علاوہ کوئی اور متبادل نہیں رہ گیا تھا"۔ کتاب میں کرداروں کی کمی نہیں۔ ان کی زبان سے اپنی باتوں کو ادا کرنا ایک دلچسپ ادبی اسلوب ہو سکتا ہے لیکن خود نوشت کی بنیادی خوبی یعنی حقیقت بیانی اس سے لامحالہ مجروح ہوتی ہے۔ کتاب آزادی کے بعد کے مسلمانوں کے حالات، مسائل، مشاکل اور مصائب کی دستاویز بننے کے ساتھ ایک عام مسلمان کے جذبات کی ترجمان بھی ہو سکتی تھی۔ مگر خود کو الگ ظاہر کرنے یا توجہ حاصل کرنے کا عمل سمندر کے ساحل پر ہونا اور بات ہے، جو یقیناً مسجد کے صحن کی دنیا سے الگ ہے۔

اس خود نوشت میں لہجے میں دلآویزی ہے، رعنائی ہے، تعبیرات میں جدت بھی ہے اور مشمولات میں تاریخی حساسیت ہے۔ جس سے مطالعہ کی لذت بھی ہے، لیکن کشتگان فکر و قلم نے جو محشر خیال قائم کیا شاید اس کا احساس مصنف کو بھی ہے۔ لایموت کی سرخی کے پس منظر میں لایموت فیہا ولا یحیی کے الفاظ شاید اسی کیفیت کے اظہار کے لیے ہیں کہ قسمت کی شقاوت ہی ہے جو جذبات و تصورات کی نارکبریٰ تک پہنچا کر اعلان کرتی ہے کہ ایک وجود، زندگی اور موت دونوں سے تہی اور عاری ہونے کا عذاب کیوں کر اپنے لیے مقدر کر لیتا ہے۔ ملکی اور عالمی پیمانے پر مسلمان کیا اسی کیفیت سے دوچار ہیں؟ یہ خود نوشت اسی کیفیت کا اعلان تو نہیں! کتاب کا ایک کردار ہے جو حکایت ہستی کو دو مہمل لفظوں خالم مخول کہہ کر بیان کرتا ہے۔ اس خود نوشت کا دوسرا نام خالم مخول بھی ہو سکتا ہے۔ (عمیر الصدیق ندوی)

محمد خالد ندوی غازیپوری، محدثین کا طریقۂ کار اپنی تصنیفات کے آئینے میں: صفحات: ۲۰۰، جمعیۃ المعارف الاسلامیہ، لکھنؤ، ۲۰۲۵ء، قیمت ۲۰۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۹۸۴۷۷۸۸۰۰۔

مستند احادیث کے جو ابتدائی مجموعے موجود ہیں ان کی تالیف و تصنیف میں تقریباً ہر محدث نے اپنا کچھ نہ کچھ الگ منہج اور طریقۂ کار پیش نظر رکھا ہے جن سے واقف ہونا حدیث کے طلبہ کے لیے ضروری ہے تاکہ ان کتابوں سے صحیح معنوں میں استفادہ کرنا آسان ہو۔ یہ کتاب اسی موضوع سے متعلق ہے۔

مصنّف ایک عرصے سے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں درس حدیث سے وابستہ ہیں۔ وہ اچھے اہل قلم بھی ہیں۔ مدرس کے ساتھ ساتھ ان کی شہرت ایک خطیب کی بھی ہے۔ حدیث سے شغل کی بناء پر محدثین کے طریقۂ کار پر گفتگو یقیناً ان کا حق ہے، بالخصوص جب اس کے اصل مخاطب طلبہ ہوں۔ صحاح ستہ کے علاوہ اس میں امام ابن خزیمہ، ابن حبان اور امام حاکم کے مستند احوال اور احادیث کی جمع و تدوین اور ترتیب و تبویب میں ان کے مناہج کا احاطہ ان کی تصانیف کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ خالص فنی انداز میں بحث و تمحیص بھی کی گئی ہے۔ مثلاً امام بخاری کے تذکرے میں صحیح بخاری اور امام مسلم کے معلقات، صیغۂ جزم، صیغۂ تمریض، پھر معلقات میں صیغۂ تمریض اور ثلاثیات کی توضیح و تشریح، موقوفات اور مقطوعات میں فرق یا پھر ترمذی کی اصطلاح "حسن صحیح" کی وضاحت کا تعلق خالص فنی بحثوں سے ہے۔ ان اصولی مباحث کو آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے تاکہ طلبہ کو ان دقیق و غامض امور کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

امام ابوداؤد کے منہج پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنّف لکھتے ہیں کہ انہوں نے حدیث کو تین قسموں صحیح، ضعیف اور صالح میں منقسم کیا ہے اور صالح کا اطلاق ان کے نزدیک ایسی روایت پر ہوتا ہے جو نہ تو بہت ضعیف ہو اور نہ ہی قوی مگر دیگر طرق سے تائید کی وجہ سے قابل قبول ہو۔ صحیح ابن خزیمہ میں طویل احادیث کو مختصر کرنے کے طریقے کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ خاص طور پر مقام استشہاد پر اکتفاء کرتے ہیں اور باقی حصے کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس کی نشاندہی وہ "وذکر الحدیث" کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ مصنّف نے صحیح ابن خزیمہ کے بارے میں رائے دی ہے کہ اس کی ہر حدیث کو بالکل صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس میں شدید ضعف والی حدیثیں بھی شامل ہیں جن کے ضعیف ہونے کی صراحت خود امام صاحب نے فرمادی ہے۔ ابن خزیمہ ابن حبان کے استاد ہیں۔ امام سیوطی صحیح ابن خزیمہ کو صحیح ابن حبان پر اور شیخ شعیب الارناؤط صحیح ابن حبان کو صحیح

ابن خزیمہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ صحیح ابن حبان کا مقام بعض صحاح سے بھی بلند ہے۔ مصنّف نے ان دونوں کے تقابل میں محتاط تبصرہ یہ کیا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو فوقیت دینے کا معاملہ گہرائی اور تنقیدی نظر کا متقاضی ہے اور لکھا ہے کہ ابن خزیمہ ایسے راوی کی حدیث کو صحیح نہیں مانتے جس کی عدالت اور جرح معلوم نہ ہو جب کہ ابن حبان ایسے راوی کی روایت کو بھی صحیح قرار دیتے ہیں اور شیخ شعیب الارناؤط اس سے متفق ہیں۔ یہ ان کے مابین بنیادی فرق ہے۔ کبار محدثین میں سب سے زیادہ امام ابن خزیمہ سے تعرض کیا گیا ہے اور ان کے لیے ۳۴ صفحات خاص کئے گئے ہیں۔ صاحب مستدرک الحاکم کی مہارت حدیث کے اکثر علماء قائل ہیں لیکن ان پر شیعی اور رافضی ہونے کا الزام بھی ہے۔ مصنّف نے اس مسئلے میں صحیح موقف اور اس کے اسباب پر بڑی محققانہ بحث کی ہے لیکن ان کا اپنا موقف واضح طور پر سامنے نہیں آسکا ہے۔

یہ اہم علمی کام محض تاریخی یا سوانحی معلومات کا مجموعہ نہیں بلکہ تحقیقی و عملی نصاب ہے جو محدثین کے مناہج کو براہ راست ذہن نشین اور کتب احادیث میں ابواب کی ترتیب، تراجم الابواب کی فہم، مکررات و معلقات کی حکمت اور روایات کے انتخاب میں مؤلف کے اجتہادی پہلو کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔ کتاب کا معتدبہ مواد اہم اور مستند عربی مصادر و مراجع سے ماخوذ و مستنبط ہے لیکن تحقیق و تصنیف پر خطابت کا اسلوب حاوی ہے، اسی لیے کتاب میں اکثر مقامات پر ضرورت اور تقاضے کے باوجود عربی مآخذ کا حوالہ نظر نہیں آیا۔ کتاب کے اندر حوالہ جات کا اگر اہتمام کیا جاتا تو اس سے مصنّف کی علمی و تصنیفی عظمت اور کتاب کی اہمیت و افادیت دوچند ہو جاتی۔ (کلیم صفات اصلاحی)

خورشید احمد اعظمی مدنی، فن اسماء الرجال اور ہندوستانی علماء کی خدمات، صفحات ۱۱۸، المکتب العلمی، مئو، ۲۰۲۵ء، قیمت ۲۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۷۹۳۱۱۸۲۳۴۔

حدیث کے راویوں کے حالات اور ان کی بیان کردہ روایتوں کی صحت و عدم صحت کی جانچ پڑتال کا نام علم اسماء الرجال ہے۔ یہ علم خالص مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ دنیا کی کسی بھی قوم کا دفتر معلومات اس قسم کے علوم سے خالی ہے۔ مراتب رواۃ اور قوت و ضعف احادیث کی تفتیش اسی علم کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ یہ علم تاریخ اسلامی کے ہر دور میں محدثین میں مقبول و محترم رہا ہے۔ ہندوستانی علماء نے بھی فن اسماء الرجال میں بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں اور اس موضوع پر قابل ذکر اور یادگار تصنیفیں کی ہیں۔ مصنّف کے بہ قول پہلے اس موضوع پر ایک مقالہ لکھا گیا تھا، بعد میں اس کو وسعت دے کر کتاب بنا دیا گیا۔

ابتداء میں حدیث کی شرعی حیثیت، اس کی اشاعت، حفاظت، تدوین کے اہتمام، احادیث کو محفوظ و یاد رکھنے کی تدبیر، موضوع احادیث سے اجتناب اور قبول روایت میں اجلّۂ صحابہ کی احتیاط کا مجملاً ذکر کرنے کے بعد علم و فن اسماء الرجال کی تعریف کی گئی ہے۔ اسماء الرجال کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اس کے ذریعے رواۃ حدیث کی شخصیت کی تعیین و تحدید اور اس کے احوال کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد علم الجرح والتعدیل کو اس کی فرع بتاتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اس علم میں راوی کے ثقہ یا ضعیف ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ مصنّف نے اس فن سے متعلق علمائے سلف کی بعض اہم کتابوں کے نام لکھے ہیں لیکن اس فہرست میں متعدد کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا تعلق فن اسماء الرجال سے نہیں ہے۔

اس کے بعد اس میدان میں کل اٹھارہ ہندوستانی محدثین اور اس فن کے ماہرین کی خدمات کا تذکرہ مختصر مگر جامع انداز میں کیا ہے۔ مثلاً چھٹی سے تیرہویں صدی ہجری تک کے علمائے رجال میں حسن محمد بن صغانی، محمد بن طاہر پٹنی، طاہر بن یوسف سندی، عبدالحق محدث دہلوی، سید محمد مرتضیٰ بن محمد بلگرامی، ملا محمد معین انصاری، عبداللہ بن عبدالقادر مدراسی، شیخ علی کبیر اور عبدالوہاب بن محمد غوث شافعی، احمد بن صبغۃ اللہ مدراسی، مولانا محمد ادریس نگرامی، شیخ ابوتراب علی، سید امیر علی اور اس فن سے متعلق ان کی تصنیفات کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے بعد چودھویں صدی ہجری کے جن علمائے فن اسماء الرجال کا ذکر اور اس موضوع پر ان کی تصنیفات پر تبصرہ وتعارف ہے ان میں اشفاق الرحمٰن کاندھلوی، شاہ محمد حلیم عطا، شیخ محمد زکریا کاندھلوی، مولانا محمد ایوب بن محمد یعقوب سہارنپوری اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے نام شامل ہیں۔

کتاب میں محدثین کے مناہج تالیف پر خصوصی توجہ کی گئی ہے اور کچھ نمونے بھی تحریر کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ امام صغانی کے چھ، طاہر پٹنی کے تین اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی ایک غیر مطبوعہ تالیف "الحاوی لرجال الطحاوی" کے کل نو منہج لکھے ہیں۔ ان کے پہلے منہج کے متعلق لکھا ہے کہ اسماء رجال کی ترتیب میں ناموں کا لحاظ تو کیا گیا ہے لیکن راویوں کے تذکرے میں کوئی ترتیب قائم نہیں ہے۔ کتاب محققانہ طرز کی حامل اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ فن اسماء الرجال سے شغف رکھنے والوں کے لیے یہ مختصر کتاب افادیت بخش ہے۔ (ک۔ص۔اصلاحی)

زریاب احمد فلاحی، محمد مصطفی الاعظمی، محمد مہر علی اور عبدالرحیم قدوائی کی تصانیف کا ایک تجزیاتی مطالعہ، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ، صفحات:۳۶۰، اشاعت دوم:۲۰۲۶ء، قیمت:۳۷۵روپے

یہ حقیقت ہے کہ مستشرقین میں ایک تعداد ان اہل علم کی رہی ہے جنہوں نے بڑا مفید علمی کام انجام دیا اوران کی کوششوں سے ہمارے اسلاف کی بعض نادر کتابیں ہمارے سامنے آئیں۔ پیش نظر کتاب میں چند مشہور معاند مستشرقین کے کاموں کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب دراصل برصغیر کے تین ممتاز فضلاء : ڈاکٹر مصطفی الاعظمی، محمد علی مہر اور پروفیسر عبد الرحیم قدوائی کی انگریزی کتابوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ ہے۔ اوراس کتاب کے آخر میں پروفیسر قدوائی کے دواہم مقالے: (۱) اکیسویں صدی کے مغربی فضلاء کے قرآنی مطالعات، (۲) سیرتِ طیبہ پر مغربی فضلاء کی تصانیف: خوش آئند رجحانات بطور ضمیمہ شامل ہیں۔

کتاب کے چند اہم ذیلی عناوین مندرجہ ذیل ہیں: تاریخ قرآن از مصطفی الاعظمی: ایک محاکمہ۔ تحریری جمع قرآن، یہودیت کی ابتدائی تاریخ، عیسائیت کی ابتدائی تاریخ۔ قرآن اور مستشرقین از محمد مہر علی: ایک محاکمہ، مستشرقین اور تاریخ قرآن، مستشرقین کے تراجم قرآن۔ اکیسویں صدی کے بعض مغربی فضلاء کے قرآنی مطالعات وغیرہ۔

یہودیت کی ابتدائی تاریخ: ایک مختصر مطالعہ - کے تحت لکھا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کی مملکت دو جڑواں ریاستوں یعنی سلطنتِ اسرائیل اور سلطنتِ یہودا میں منقسم ہوگئی۔ ان دونوں، ریاستوں میں سخت رقابت اور کشمکش روزاول سے جاری رہی۔ یہودی مملکت کے سیاسی جاہ وحشم کا آفتاب ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ڈوب گیا اور بعد ازاں پھر کبھی مطلع تہذیب پر نمودار نہیں ہوا (ص ۸۸)۔

مہر علی (م: ۲۰۰۷) نے قرآن کے ضمن میں مستشرقین کے دو طبقے قائم کیے ہیں۔ پہلا طبقہ ابتدا ہی سے قرآن پر مسلسل یلغار کرتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا خاص ہدف قرآن مجید کو بشری تصنیف ثابت کرنا ہے۔ غور کریں تو بنیادی طور پر جملہ غیر مسلمین کا یہ نقطۂ نظر اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود قرآن کریم ہے، کیوں کہ مشرکینِ مکہ بھی قرآن کے خلاف بالکل یہی الزام دہرایا کرتے تھے:

إِنْ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (المدثر: ۲۵) (یہ سوائے انسانی کلام کے کچھ بھی نہیں) (ص ۱۵۶)

یہ کتاب اردو حلقہ کے لیے عمدہ علمی سوغات ہے۔ مصنف زریاب احمد فلاحی ایک باصلاحیت اسکالر ہیں۔ انہیں اب تک کئی علمی پروجیکٹوں پر کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔

(فضل الرحمن اصلاحی)

جائیں گے دوبارہ طیبہ ہم

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
نعمانی منزل، نزد ابوہریرہ مسجد۔ ہمدرد نگر۔بی، جمال پور، علی گڑھ

پھر ہوگا خدا کا ہم پہ کرم ، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ
جائیں گے دوبارہ طیبہ ہم ، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

چاہے جو خدائے عَزَّوَجَلَّ، ہو جائے گا ہر اک عقدہ حل
ہو جائیں گے سب اسباب بہم، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

طیبہ کو اڑے گا طیّارہ ، ساتھ اس کے چلے گی بادِ صبا
اور بادِ مخالف جائے گی تھم ، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

کیوں ایسا دعویٰ کریں مہمل، چل سکتا نہیں کوئی سر کے بل
رکھیں گے ادب سے وہاں قدم، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

دیکھیں گے وہ ارضِ خلد نما، ہیں انؐ کے جہاں نقشِ کفِ پا
یاد انؐ کو کریں گے پھر پیہم ، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

مسجد میں وہ چلتے فوّارے، وہ شبنم شبنم نظّارے
پھر دیکھیں گے وہ منظر جھم جھم، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

اُس گنبد اور میناروں سے، سبز اور خنک نظاروں سے
پھر ہو گا نگاہوں کا سنگم ، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

مشتاق نگاہوں سے کرکے، روضے کی زیارت جی بھر کے
دل و جاں کا کریں گے تزکیہ ہم، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

دالان میں مسجدِ نبویؐ کے زمزم کے پیالے پی پی کے
ڈھل جائیں گے دل کے سارے غم، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

چھٹ جائیں گے غم کے بادل سب ہو جائے گا حاصل ہر مطلب
آئے گا مسرت کا موسم، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

آقاؐ سرِ محشر نکلیں گے ہاتھوں میں لِوائے حمد لیے
پھر چلیں گے ہم بھی زیرِ علم، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

حالات ہوں دنیا کے کچھ بھی، میں لکھتا رہوں گا نعتِ نبیؐ
نہ رکے گا میرا کبھی قلم، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

محشر میں جو سامنے آئے گی فہرستِ ثنا گویانِ نبیؐ
مرا نام بھی ہو گا اس میں رقم، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

پسِ مرگ رئیسِ غم پرور، کام آئے گی توصیفِ سرورؐ
جب ہو گا نہ کوئی بھی ہمدم، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ

رسید کتب موصولہ

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، افکار (شعری مجموعہ): احمد فرید عباسی، رفیع میموریل انٹر کالج، چکچھئی، سدھارتھ نگر، صفحات: ۵۰۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۹۵۸۲۲۲۴

مولانا عبد الغنی فیضی، چراغِ کفِ دَرویش (غزلیں): مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، صفحات: ۲۱۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

مولانا عبد الغنی فیضی (ترتیب و مقدمہ) ڈاکٹر روبی نکہت، درگنجینۂ گوہر (نظمیں): مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، صفحات: ۲۰۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۵۰ روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

دی بایو گرافی آف مائی پروفٹ: نورین کامران، پتہ، صفحات، سالِ اشاعت، قیمت اور موبائل نمبر: درج نہیں

سریندر دیول (مترجم)، استوتی اگروال، ساحر لدھیانوی (انسانیت اور محبت کا شاعر): لچھمی آفسیٹ، سنجے گاندھی پورم، فیض آباد روڈ، لکھنؤ، صفحات: ۲۷۹، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۱-۸۳۱۸۹۰۴۳۱۷

معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی، قائد ملت، مسیحائے قوم: خبر دار پبلی کیشنز، دہلی، صفحات: ۴۰۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۱۰۷۸۰۵۶۳

حافظ شاہد رفیق، لذیذ بود حکایت: دار الفہیم پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، صفحات: ۵۷۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۳۶۰۱۰۲۲۴

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، مسلم یونی ورسٹی اور ۱۹۶۵ء: دفتر دینی تعلیمی کونسل، عارف آشیانہ، چوک، لکھنؤ، صفحات: ۳۶۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۷۳۹۰۰۲۶۸۰۸

شکیل احمد مئوی، مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اور ان کی فقہی خدمات: مدرسہ مرقاۃ العلوم، مئوناتھ بھنجن، صفحات: ۲۸۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۸۳۹۴۵۶۷۸۶

ڈاکٹر عطا خورشید، مجموعۂ نثر سرسید (۲۰ جلدیں) ایک تعارف: مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، علی گڑھ صفحات: ۱۰۱، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: درج نہیں۔ موبائل نمبر: ۹۲۵۹۱۳۶۷۱۳

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس ودبیر	250/-
سیرۃ النبی (خاص ایڈیشن مکمل ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	125/-
مقدمہ سیرۃ النبی	30/-	سفرنامہ روم ومصروشام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات شبلی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعرالعجم اول	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعرالعجم دوم	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعرالعجم سوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعرالعجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعرالعجم پنجم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن)		انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-
تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	350/-	مکاتیب شبلی اول // //	--
خطبات شبلی	150/-	مکاتیب شبلی دوم // //	--
الکلام	350/-	اسلام اور مستشرقین چہارم	
علم الکلام	200/-	(علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

Total Pages: 84 (Including Cover Page)

MAY 2026 Vol- 213(5) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF **AZM/NP- 43/2026-28**

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں وسلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سو سال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-

تاریخ ساز ادارے کے معاون خاص بنئے

برصغیر کے قدیم ترین علمی اور تحقیقی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کو خودکفیل بنائیے۔ سنہ ۱۹۱۴ سے قائم یہ وہی ادارہ ہے جس نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف سیرت النبی سمیت ۲۸۰ بیش قیمت علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ آج جبکہ تاریخ کے نام پہ مسلمانان ہند پر یلغار ہو رہی ہے، اس ادارے کو تقویت دینا اور خودکفیل بنانا پوری ملت کا فرض ہے۔ کم از کم پانچ ہزار روپے سالانہ تعاون فرمائیں۔ اکاؤنٹ کی تفصیل اور QR کوڈ حاضر ہے۔

A/C: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH
A/C No: 0504010100032752
Bank Name: PUNJAB NATIONAL BANK
Branch: HEERPATTI - AZAMGARH (U.P.)
IFSC: PUNB 0476100 - Bank Code: 476100

Darul Musannefin Shibli Academy
Shibli Road, Azamgarh-276001, U.P.
Contact: Dr Fakhrul Islam Azmi, Dy. Director
Mobile: 99352 33940
Email: info@shibliacademy.org [to inform after remittance]
www.shibliacademy.org

Scan and pay with any BHIM UPI

تعاون بھیج کر اپنے پورے پتہ کے ساتھ ہمیں ای-میل سے مطلع کریں۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان (ڈائرکٹر)